مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ **الامداد** لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۸ | ذی الحجة ۱۴۳۸ھ | ستمبر ۲۰۱۷ء | شمارہ ۹

رفع الموانع

راہِ خدا سے روکنے والے افعال کا تدارک

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ = /۴۰ روپے   زر سالانہ = /۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۲۳۰۴۹

پتہ دفتر
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرّف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

رفع الموانع

(راہِ خدا سے روکنے والے افعال کا تدارک)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	خطبۂ ماثورہ	۷
۲	تمہید	۸
۳	خوشگوار اور ناگوار امور	۹
۴	بعض صوفیاء کی غلط فہمی	۱۰
۵	بقراط کی حکایت	۱۱
۶	کم علمی کی خرابی	۱۲
۷	عبادت میں یکسوئی	۱۴
۸	وساوس کا علاج	۱۵
۹	کاہلوں کا حال	۱۷
۱۰	علم کے فوائد	۱۸
۱۱	رفع اشکال	۱۹
۱۲	محبت ورحمت	۲۰
۱۳	شان بزرگان	۲۱
۱۴	آج کل کے بزرگ	۲۲
۱۵	تعظیم اور تہذیب	۲۳
۱۶	طبعی راحت وکلفت	۲۵
۱۷	انبیاء واولیاء کا حال	۲۶
۱۸	تکلیف پر راضی ہونے کی مثال	۲۷
۱۹	کامل کی شان	۲۹
۲۰	حقوق مصائب	۳۲

۲۱.....	قرآن کا اعجاز.....	۳۳
۲۲.....	عوام کی تسلی کا سامان.....	۳۵
۲۳.....	محبت کا تقاضا.....	۳۶
۲۴.....	محبت کا مظاہرہ.....	۳۸
۲۵.....	صحابہ کا صبر واستقامت.....	۴۰
۲۶.....	خدمت دین.....	۴۱
۲۷.....	نسخہ کیمیا.....	۴۲
۲۸.....	فقدان عمل.....	۴۳
۲۹.....	ہدایت کا راستہ.....	۴۴
۳۰.....	طبیب کا منصب.....	۴۶
۳۱.....	ناز اور عجب.....	۴۸
۳۲.....	عفو ودرگذر.....	۴۸
۳۳.....	آیت کا شان نزول.....	۴۹
۳۴.....	انہاک محبت.....	۵۰
۳۵.....	ابتلاء محبت.....	۵۲
۳۶.....	محبت اور شرک.....	۵۳
۳۷.....	ابراہیم بن ادھم کا حال.....	۵۴
۳۸.....	درجات محبت.....	۵۶
۳۹.....	توجہ الی اللہ.....	۵۷
۴۰.....	مردہ کا تخیل.....	۵۹
۴۱.....	حرام محبت.....	۶۰
۴۲.....	حب مال.....	۶۱
۴۳.....	تقویٰ.....	۶۴
۴۴.....	تزکیہ نفس.....	۶۶
۴۵.....	حرص کی قسمیں.....	۶۷

وعظ

رفع الموانع

(راہِ خدا سے روکنے والے افعال کا تدارک)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے راہِ سلوک طے کرنے والوں کو جو مشکلات پیش آتی ہیں اور اس راہ میں قدم رکھنے والوں کو جو رکاوٹیں اور موانع پیش آتے ہیں ان موانع طریق کی تفصیل کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ کو بھوپال سے آئے ہوئے چند مہمانوں کی خواہش پر بیٹھ کر فرمایا۔ ۱۵۰ کے قریب سامعین تھے۔ جن کی اکثریت صلحاء پر مشتمل تھی اور اہل علم کم تھے۔ مولانا محمد عبداللہ صاحب گنگوہی نے قلم بند کیا۔ حکیم الامت نے بیان فرمایا کہ اللہ کی یاد سے غفلت میں ڈالنے والی دو چیزیں ہیں ایک مصائب دوسرے انعامات ان میں غلو ہونے سے یاد الٰہی میں غفلت ہوتی ہے اس لئے ان دونوں میں غلو سے بچنے اور اعتدال پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی اس کے حصول کا طریقہ اور علاج بھی ارشاد فرمایا سالکین کے لئے یہ وعظ بہت مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۳۸ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَمَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَھۡدِ قَلۡبَہٗ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝ وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِکُمۡ وَاَوۡلَادِکُمۡ عَدُوًّا لَّکُمۡ فَاحۡذَرُوۡھُمۡ ۚ وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَاَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ؕ وَاللّٰہُ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَیۡرًا لِّاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعِفۡہُ لَکُمۡ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ شَکُوۡرٌ حَلِیۡمٌ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّھَادَۃِ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴾ (۱)

---

(۱) ''کوئی مصیبت بدوں حکم خداوندی نہیں پہنچتی اور جو شخص اللہ پر پورا ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے قلب کو صبر ورضا کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (خلاصہ یہ کہ ہر امر میں) اللہ کا کہنا مانو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانو اور اگر تم (اطاعت سے) اعراض کروگے (یاد رکھو) ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صاف صاف پہنچادینا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر توکل رکھنا چاہیے۔ ←

تمہید

یہ سورۃ تغابن کا ایک پورا رکوع ہے ہر چند کہ آیتیں متعدد ہیں لیکن ان سب میں ایک جہت جامعہ ہے جس کی وجہ سے تمام آیتیں تلاوت کی گئیں اور گو بیان میں اختصار ہوگا لیکن بوجہ ارتباط آیات وجامعیت(۱) بیان کے اس مختصر ہی میں تمام آیتوں کے متعلق بیان ہوجائے گا۔اب میں پہلے وہ عنوان درج کردوں جس کی یہ آیتیں بمنزلہ شرح اور تفسیر کے ہیں تا کہ ان کو تمام بیان میں پیش نظر رکھا جائے اور اس سے یہ بھی اجمالاً معلوم ہوگا کہ آیات قرآنیہ میں کیسا ارتباط ہے(۲) لیکن یہ وقت اس مسئلہ پر مفصل گفتگو کرنے کا نہیں ہے اس لئے اگر اس کو بیان کیا جاوے گا تو اصل مضمون مقصود رہ جائے گا اس لئے اصل مضمون کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اس تمام رکوع کے اندر جہت جامعہ جو بمنزلہ عنوان کے ہے صرف ایک شے ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں موانع طریق کو بیان فرمایا ہے یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کے راستہ سے روکنے والی ہیں اور اللہ کی یاد سے غفلت میں ڈالنے والی ہیں یہ ان کی فہرست ہے لیکن صرف موانع کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ

→ اے ایمان والو! تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے (دین کے) دشمن ہیں تم ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کر جاؤ اور بخش دو تو اللہ تمہارے گناہوں کو بخشنے والا اور تمہارے حال پر رحم کرنے والا ہے، تمہارے مال اور اولاد تمہارے لئے آزمائش ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس کے لئے بڑا اجر ہے تو جہاں تک تم سے ہوسکے اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے احکام سنو اور مانو اور خرچ بھی کیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی فلاح پانے والے ہیں اور اگر تم اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح قرض دوگے اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا قدردان اور بڑا بُردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے زبردست اور حکمت والا ہے'' سورۃ التغابن: ۱۱ تا ۱۸۔

(۱) ایک دوسرے سے مربوط ہونے اور جامع بیان کی وجہ سے مختصر وقت میں سب آیات کے متعلق بیان ہوجائے گا (۲) ربط۔

ساتھ ساتھ اسکا علاج بھی مذکور ہے اور یہ حق تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ جہاں کسی مضرت کا وجود ہے(۱) وہاں اس کا دفع بھی موجود ہے اور اس حکمت کا ظہور تمام کائنات عالم پر ہوا ہے اور قرآن مجید میں تو خصوصیت کے ساتھ ہوا ہے کہ جہاں امراض کا ذکر ہے وہاں دوا بھی ہے اور جس جگہ معاصی کا بیان ہے وہاں اس کا علاج بھی۔ یہ ہے حاصل آج کے بیان کا۔

خوشگوار اور ناگوار امور

اس کے بعد سمجھئے کہ وہ موانع چند کلیات ہیں اور ان کی بے شمار جزئیات ہیں۔ پھر ان کلیات کے لئے دو کلی جامع ہیں اس طور سے یہ تمام مضمون باہم متناسق اور منتظم ہے۔ وہ موانع باوجود تعدد و تکثر جزئیات کے صرف دو امر کلی کے اندر منحصر ہیں(۲) یعنی صرف دو مانع ہیں اول ضراء یعنی وہ حالت کہ جس کا عروض انسان کو ناگوار ہے دوسرے سراء یعنی وہ کیفیت جس کا ظہور آدمی کو گوارا ہو(۳) لیکن یہ دونوں حالتیں مطلقاً مانع نہیں بلکہ قید افراط کے ساتھ یعنی ضراء میں وہ حالت جو زیادہ ناگوار ہے اور سراء جہت میں وہ حال جو زیادہ گوارا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ طریق جس کے موانع میں ہم کلام کر رہے ہیں اس سے مراد حق تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے اور وہ کوئی محسوس شے نہیں کہ کوئی بیٹا ہو یا سڑک ہو بلکہ حاصل اس کا شغل مع اللہ ہے(۴) اور شغل قلب کا فعل ہے جو کم و بیش ہر مومن کو حاصل ہے یہ تو حاصل ہوا طریق کا اب سمجھو کہ ہر شخص پر اکثر اوقات ان دو حالتوں یعنی سراء یا ضراء(۵) میں سے ایک نہ ایک

(۱) جہاں ضرر کا وجود ہو وہیں اس کا علاج بھی ہوتا ہے (۲) سارا مضمون ایک دوسرے سے مربوط اور رکاوٹیں اگرچہ متعدد ہیں اور بہت ہیں لیکن ان سب کا احاطہ دو کلیات میں ہو جاتا ہے (۳) رکاوٹیں صرف دو ہیں ایک ناگوار حالت دوسری خوشگوار حالت (۴) اللہ کی طرف متوجہ رہنا (۵) خوشی و غم۔

حالت کا عروض علی سبیل التعاقب والتناوب ضرور رہتا ہے(۱)۔ بعض مرتبہ تو ادنیٰ درجہ ان حالتوں کا ہوتا ہے یعنی ناگواری اور خوشگواری کم درجہ کی ہوتی ہے کہ قلب کو اپنی اصلی حالت سے ازجارفتہ نہیں کرتی اور بعض مرتبہ زیادہ ہوجاتی ہے کہ قلب کو اپنی طرف مشغول کرلیتی ہے اور اپنی اصل حقیقت سے دور کردیتی ہے۔ بس یہ ہی حالت مانع طریق ہے باقی اس حالت کی کوئی ایسی تحدید کہ اس کا فلاں درجہ مانع ہے، نہیں ہوسکتی بطور تشکیک کے حسب اختلاف قوت شغل مع اللہ کی ہر فرد کے اعتبار سے اس میں اختلاف ہوگا(۲) اور یہ شغل مع اللہ وہ چیز ہے کہ تمام شریعت جس کا ایک جزء طریقت بھی ہے، اسی شغل مع اللہ کی شرح (۳) اور تفصیل ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ جس کا ایک جزء طریقت بھی ہے اور طریقت کو شریعت پر عطف نہیں کیا، تو وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت اور طریقت میں تباین بمعنی تنافی نہیں (۴) ہاں ایسا تباین کہا جاسکتا ہے جیسے کُل میں اور اس کے اجزاء خارجیہ میں تباین ہوتا ہے کہ چھت کو یا دیوار کو بیت (۵) یا بیت کو چھت یا دیوار نہیں کہہ سکتے اور اجزاء ذہنیہ میں تو کل کا اس کے اجزاء پر اور اجزاء کا اپنے کل پر صادق آنا بھی ضروری ہے اس لئے میں تباین کے لفظ کو کہ موہم ہے چھوڑ کر یہ کہوں گا کہ شریعت اور طریقت۔

بعض صوفیاء کی غلط فہمی

اور جو کہتے ہیں کہ شریعت میں بہت سی چیزیں حرام ہیں اور طریقت میں حلال ہیں، کاش اس کا عکس کرتے (۶) تو اس سے تو اچھا تھا یعنی یہ کہتے کہ شریعت میں بہت سی چیزیں حلال ہیں اور طریقت میں حرام تو ہم اس کی یہ تاویل کرلیتے کہ مطلب ان کا یہ ہے کہ نرے فتوے پر مت رہو اس لئے کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے خاص

(۱) دونوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت یکے بعد دیگرے پیش آتی ہے (۲) ہر شخص کی توجہ الی اللہ میں اختلاف ہے (۳) پوری شریعت تعلق مع اللہ کی شرح ہے (۴) ایک دوسرے کے خلاف نہیں (۵) گھر (۶) کاش اس کا الٹا خیال کیا ہوتا۔

تعلق پیدا کرنا منظور ہے اس لئے ہم کو بہت وہ چیزیں جن کو حق تعالیٰ نے شریعت میں بوجہ اپنے بندوں کے ضعف کے بطور رخصت (۱) کے جائز کردی ہیں ان کے ساتھ ہم کو عملاً ناجائز کا سا برتاؤ رکھنا چاہیے تاکہ عزیمت (۲) پر عمل فوت نہ ہو لیکن اس کا تو نام ونشان نہیں بلکہ برعکس اس کے جو اعمال کہ شریعت میں حرام ہیں ان کے نزدیک جائز ہیں۔ شراب پینا حرام ہے اور ان کے نزدیک جائز ہے اور بہت سے صوفی ایسے بھی دیکھے گئے جو امرد پرستی (۳) کو سبب قرب کا جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود ان لوگوں کو دیکھا ہے کہ ایک ایک لڑکا ان کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے جواز کے لئے ایک حدیث گھڑی ہے وہ یہ ہے (رأیت ربی فی صورۃ شباب امرد) ''میں نے اپنے رب کو جواں مرد کی صورت میں دیکھا'' اول تو یہ حدیث ہی نہیں، کسی کی گھڑت ہے اور اگر بالفرض ہو بھی تو توجیہ اس کی یہ ہوگی کہ مراد اس میں ایک تجلی مثالی ہے جو کہ مخصوص امرد حی (۴) کے ساتھ نہیں ہے بلکہ بزرگوں کو یہ تجلی مختلف صورتوں میں ہوئی ہے اور حاصل اس کا صرف مظہریت ہے یعنی ان کو ان صورتوں میں حق تعالیٰ کے علم قدرت وغیرہ صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس حدیث سے قطع نظر کرکے کہیں کہ ہم امارد (۵) کو بحیثیت مظہریت ہی کے دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے سو ایسے مشاہدہ تو جس طرح امرد میں ہے اسی طرح بوڑھے میں بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ امرد بے ریش (۶) تو سبب قرب کا ہو اور سو برس کا بوڑھا یا ایک ماہ کا بچہ نہ ہو۔

بقراط کی حکایت

بقراط کی حکایت شیخ سعدی شیرازی نے لکھی ہے کہ چلا جارہا تھا ایک شخص کو دیکھا کہ پسینہ پسینہ اور بے خود ہورہا ہے، پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے لوگوں نے کہا

(۱) رعایت (۲) بلند حوصلگی (۳) نابالغ بچوں سے تعشق کو (۴) زندہ بچہ (۵) نابالغ بچوں کو (۶) بغیر ڈاڑھی والا بچہ۔

کہ یہ ایک بزرگ ہے اس نے ایک حسین لڑکے کو دیکھ لیا ہے اس میں حق تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کررہا ہے، بقراط نے کہا کیا حق تعالیٰ نے صرف یہ ہی لڑکا ہی اپنی قدرت کے اظہار کے لئے پیدا کیا ہے اور کوئی نہیں، ایک دن کا بچہ بھی تو اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اس کو دیکھ کر اس کا حال متغیر نہ ہوا۔(۱) حق تعالیٰ کی صنعت دیکھنے کے اندر تو دونوں برابر ہیں بلکہ طفل یک روزہ(۲) کے اندر بوجہ زیادہ عجیب ہونے کے قدرت کا ظہور زیادہ ہے یہ تو ایک حکیم یونانی کی حکایت ہے اس کو سن کر تو شاید لوگ رد کردیں کہ اس کی بات کا کیا اعتبار ہے لیکن شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تصدیق کرتے ہیں اب تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ وہ تو سب کے نزدیک مسلم ہیں صوفی بھی ہیں اور حکیم بھی وہ فرماتے ہیں محقق ہماں بیند اندر ابل کہ درخو بردیاں چین وچگل۔ یعنی جو شخص حقیقت بین ہے وہ اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے بلکہ اونٹ کے دیکھنے میں تو نفع محض ہے اور امرد کے دیکھنے میں فتنہ کا احتمال بھی غالب ہے اسی واسطے اونٹ کے دیکھنے کا امر بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿أَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ ''کیا وہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے پیدا کیا گیا'' یہ نہیں فرمایا: (أَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الامارد كَيْفَ خُلِقُوا) ''کیا وہ امردوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیے گئے''

کم علمی کی خرابی

یہ جہلا صوفیاء کفار قریش سے بھی بڑھ گئے ہیں اس لئے کہ انہوں نے قرآن شریف کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی: ﴿ائْتِ غَيْرِ هٰذَا اَوْ بَدِّلْهُ﴾ یعنی اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن جس میں

(۱) اس کی حالت کیوں نہ بدلی (۲) ایک دن کا بچہ۔

ہمارے معبودوں کی برائی نہ ہولائیے یا اسی میں ترمیم کردیجئے جس کا جواب ارشاد ہوا ہے: ﴿قُلْ مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ﴾ یعنی میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں اس کو اپنی طرف سے بدل دوں جواب میں صرف تبدیل کی اس لئے نفی فرمائی کہ اس سے ہی تجدید کی نفی بھی ہوگی اس لئے کہ جب ترمیم بھی اختیار میں نہیں ہے تو نیا قرآن لانا تو بطریق اولیٰ منتفی (۱) ہوگیا اور ان حضرات نے خود ہی ایک قرآن بنالیا کہ حق تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ﴾ ''کیا وہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا'' اور یہ اپنے طرز عمل سے کہہ رہے ہیں: (اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الامارد کَیْفَ خلقوا ﴾ ''کیا وہ لوگ امردوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیے گئے'' انہوں نے تو صرف درخواست کی تھی مگر انہوں نے بدل کر دکھلا دیا۔ گویا در پردہ قرآن مجید کا مقابلہ ہے کہ قرآن میں طریق قرب الٰہی کے مذکور نہیں ہیں ہم نے ایجاد کئے ہیں غرض قائل ہوئے تو اس کے ہوئے کہ طریقت میں بہت سی حرام چیزیں بھی حلال ہیں اور یہ مسلک نیا نہیں ہے پہلے بھی ان کے ہم خیال لوگ ہوئے ہیں چنانچہ ایک فرقہ اباحیہ مشہور ہے کہ ان کے نزدیک ہر شے مباح ہے (۲) اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو اہل بدر کی شان میں وارد ہوئی ہے: (اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم) (۳) جو چاہو عمل کرو میں نے تمہارے لئے مغفرت کردی۔ نیم ملا خطرہ ایمان کا مضمون ہے یہ ادھورے علم کی خرابی ہے حالانکہ خود اس حدیث کے اندر غور کرنے سے جواب ظاہر ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ لفظ مغفرت فرمانا خود دال ہے گناہ ہونے پر اگر گناہ نہ ہوتا تو غفرت ارشاد نہ ہوتا۔ احلت یا احللت ہوتا۔

(۱) نیا قرآن لانے کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگئی (۲) ہر کام جائز ہے (۳) السنن الکبریٰ للبیہقی: ۹۔۱۴۶، فتح الباری لابن حجر: ۱۱۔۴۷ کنز العمال: ۳۷۹۵۷۔

غرض کمالات میں کوئی مرتبہ ایسا نہیں ہے کہ اس پر پہنچ کر احکام شرعی مکلّف سے ساقط ہوجاویں۔ الحاصل شریعت اور طریقت تنافی نہیں ہے اس لئے میں نے طریقت کا شریعت پر عطف نہیں کیا۔ بہرحال تمام شریعت شرح ہے اسی شغل مع اللہ کی یہ تو بیان تھا طریق کا۔ اور مانع کا حاصل ہوگا شغل الغیر یعنی قلب کو غیر حق کے ساتھ مشغول کردینا اس لئے کہ قلب ایسی چیز ہے کہ ایک وقت میں دوطرف اس کو توجہ تام نہیں ہوتی جب غیر کے ساتھ مشغولی ہوگی تو اس سے لامحالہ حق تعالیٰ سے غفلت ہوگی۔

عبادت میں یکسوئی

اسی واسطے فلاسفہ نے کہا ہے: (النفس لا تتوجه الی شیئین فی آن واحد) اور یہاں سے ایک کام کی بات مستنبط ہوتی ہے(۱) وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کی شکایت کیا کرتے ہیں کہ ہم کو نماز میں وسوسے آتے ہیں اور اس کے مختلف علاج کرتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ زمانہ تو اس کے لئے وظیفے بتلاتے ہیں کہ یہ وظیفہ پڑھو وسوسے نہ آئیں گے اور اس میں یہ قید لگادی کہ جی لگا کہ پڑھنا۔ اس بے چارہ نے پڑھنا شروع کیا تو وسوسے وہاں بھی موجود تھے۔ پھر شیخ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت وسوسے آتے ہیں، انہوں نے اس کے لئے بھی ایک وظیفہ اور بتادیا اب اس میں بھی وسوسے ہیں پھر اس کے لئے بھی تیسرا وظیفہ بتادیا تسلسل محال لازم آگیا اور ان حضرات نے یہ ثابت کردیا کہ نماز میں جی لگنا اور وساوس کا قطع ہوجانا محال ہے اس لئے کہ تسلسل کو مستلزم ہے(۲) اور جو مستلزم محال کو ہو وہ خود محال ہے اب وہ بے چارہ پریشان ہوکر سمجھ جاتا ہے کہ بس جی نماز میں جی لگنا

(۱) نکلتی ہے (۲) اس سے تسلسل لازم آتا ہے جو ناممکن ہے پس وسوسے سے بچنا بھی ناممکن ہے۔

میرے لئے تو بہت مشکل ہے اور وظیفے پڑھتا پڑھتا تھک جاتا ہے بعض مرتبہ انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ نماز بھی چھوڑ دیتا ہے۔ صاحبو کوئی ان شیخ سے پوچھے کہ وظیفہ پڑھنے اور وساوس کے قطع ہونے میں کیا مناسبت ہے۔ آخر مرض اور دوا میں کوئی تناسب تو ہونا چاہیے، خوب سمجھو کہ وساوس کا حاصل شغل بالغیر ہے(۱) اس کا بجز اس کے کچھ علاج نہیں ہے کہ اپنے قصد اور اختیار سے خدا کے ساتھ مشغول ہو، وساوس خود بخود منقطع ہو جائیں گے۔

وساوس کا علاج

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص ٹکٹکی باندھ کر ایک شے کی طرف دیکھ رہا ہے اگر اس کی نگاہ بشراشرہ(۲) اس کی طرف ہے تو دوسری شے اس کو ہرگز نظر نہ آئے گی اور اگر اس میں کمی ہے تو آنکھ کی شعاعیں دوسری طرف بھی جائیں گی اور دوسری چیز بھی نظر آئے گی تو جس طرح ظاہر کی آنکھیں ہیں اسی طرح قلب کی بھی آنکھ ہے اگر قلب کو بتامہ شے واحد(۳) کی طرف متوجہ کر دیا جائے گا تو قلب کی شعاعیں دوسری طرف منتقل نہ ہوں گی بس کسی شے کا خیال نہ آئے گا اور اگر توجہ میں کمی ہے تو ضرور دوسری چیزیں بھی اس میں آئیں گی۔ پس علاج یہ ہے کہ جب وساوس آئیں فوراً متوجہ الی الحق ہو جاؤ(۴) اور پھر اگر آئیں پھر اس توجہ کو تازہ کر لو لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ توجہ الی الحق کے الحاء(۵) مختلف ہیں جن پر توحید اور تمیہ کی شان غالب ہے تو ان کو براہ راست بلاواسطہ توجہ الی آنحضرت الحق حاصل ہو جاتی ہے، غائب کی طرف متوجہ ہونے میں ان کو کوئی شے مانع نہیں ہوتی اور

(۱) دوسرے کی طرف متوجہ ہونا ہے (۲) مکمل طور پر (۳) مکمل طور پر کسی ایک جانب متوجہ کر دے (۴) اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ (۵) حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی مختلف صورتیں ہیں۔

جن کو یہ دولت حاصل نہیں ہے ان کے لئے توجہ الی الحق یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نام پاک کی طرف توجہ کرے اور نماز کے اندر خصوصیت کے ساتھ یہ طریق اختیار کریں کہ جو کچھ زبان سے کلمات ادا کریں اور جوارح سے(۱) جو افعال کریں ان کی طرف توجہ کریں اور اول ان کا قصد کرلیں اور ان کلمات اور افعال کی طرف توجہ کرنا توجہ الی الغیر نہ کہلائیگا اس لئے کہ غیر وہ ہے جو حق سے حاجب ہو اور جو موصل ہو(۲) اس کی طرف توجہ کرنا عین توجہ الی الحق ہے(۳) اور یہ طریق میرا ایجاد کیا ہوا نہیں بلکہ اس کی دلیل موجود ہے۔ دیکھو حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص دو رکعتیں پڑھے اور ان کی صفت یہ ہو کہ مقبلاً علیھما بقلبہ یعنی ان دو رکعتوں پر اپنے دل سے متوجہ ہو اب دیکھ لیجئے کہ رکعتوں کی حقیقت کیا ہے، رکعت نام ہے قیام قرأت رکوع سجود کا پس حاصل مقبلاً علیھما کا یہ ہوا مقبلا علی القراءۃ والرکوع والسجود پس عبادت کے اجزاء خارجیہ اور ذکر اللہ کی طرف متوجہ ہونا مامور بہ اور مطلوب ہوا اور یہ ہی عین توجہ الی اللہ ہے اس لئے کہ موصل الی اللہ ہے(۴)۔ پس اس کو الی غیر الحق(۵) نہ کہیں گے اور جن کی چشم عبرت(۶) حق تعالیٰ نے کھول دی ہے ان کے لئے ہر شے موصل الی الحق ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہرچہ بینم در جہاں غیر تو نیست　　یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو(۷)

پس جب نماز میں وسوسے آئیں ذکر کی طرف متوجہ ہوجاؤ، ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تسبیح اور قرأت یاد سے نہ پڑھو

(۱) اعضاء (۲) حق تک پہنچانے والا (۳) وہ حق ہی کی طرف توجہ ہے (۴) اللہ تک پہنچانے والا ہے (۵) اس کو غیر حق نہ کہیں گے (۶) عبرت کی آنکھ (۷) ''یعنی تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے، ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے، غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے''۔

ارادہ سے پڑھو۔ مولانا اس کی مثال دیا کرتے تھے کہ میاں ہماری نماز تو ایسی ہے جیسے گھڑی کی کوک جب اس کو کوک (۱) دیتے ہیں تو برابر چوبیس گھنٹے تک چلتی رہتی ہے اسی طرح ہم نماز جب شروع کرتے ہیں تو ہم کو کچھ خبر نہیں ہوتی، رکوع سجود قیام قرأت سب آپ سے آپ ادا ہوتے رہتے ہیں، نماز بھی ادا ہوتی ہے اور دکان اور بازار کے کام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جب سلام پھیرتے ہیں اس وقت خبر ہوتی کہ ہم نے نماز پڑھی ہے وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ہم نماز محض یاد پر پڑھتے ہیں علاج اس کا یہ ہے کہ نماز یاد سے نہ پڑھو ارادہ سے پڑھو یعنی ہر فعل کرنے اور ہر کلمہ کہنے کے وقت مستقل ارادہ کرو اسی شان سے تمام نماز ختم کرو۔ دیکھیں کیسے وسوسے آتے ہیں البتہ نفس کو تھوڑی سی دشواری اور مشقت ضرور ہوگی۔ کہ اس کو جو عادت تھی کہ شتر بے مہار (۲) کی طرح جہاں چاہتا تھا پھرتا تھا، اسکو مقید کرنا پڑے گا سو اتنی دشواری اور مشقت کوئی مشقت نہیں ہے، کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ نفس کو اتنی محنت بھی نہ کرنی پڑے۔ صاحبو اگر جان بھی اس راہ میں جا کر کچھ مل جائے تو ارزاں ہے۔ متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے (۳) اور یہاں جان دی بھی نہیں گئی بلکہ جان لی گئی ہے کہ ادھر ادھر جو نفس مارا مارا پھرتا ہے اس کو ایک جگہ آرام دینا ہے اگر اتنی مشقت بھی گوارا نہیں تو یہ احدی (۴) بننا ہے۔

کاہلوں کا حال

واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے، باری باری سے ایک دن ایک لیٹتا تھا اور دوسرے دن دوسرا لیٹتا تھا ایک روز کا قصہ ہے کہ ایک سوار جا رہا تھا اس لیٹے ہوئے نے کہا کہ میاں سوار میرے سینہ پر جو یہ بیر رکھا ہے ذرا تکلیف کر کے یہ

(۱) چابی (۲) آزاد اونٹ (۳) جان جاں کا قرب تو جان دیگر بھی حاصل ہو جائے تو سستا سودا ہے (۴) سست الوجود۔

میرے منہ میں ڈال دو، اس سوار نے کہا کہ جو تیرے پاس بیٹھا ہے یہ ڈال دے گا، وہ بیٹھا ہوا بولا کہ جناب بس رہنے دیجئے ایک روز میں لیٹا تھا اور میرے منہ میں کتا موت رہا تھا(۱) اس نے اس کو ہٹایا نہیں، اب میں اس کے منہ میں بیر کیوں ڈال دوں۔ اے صاحبو! خدا کی طلب کا دعویٰ اور پھر اس قدر سستی اور آرام طلبی آپ چاہتے ہیں کہ ہم کو اتنا بھی کام کرنا نہ پڑے مفت سب مل جائے اتنا آسان طریق اور وہ بھی آپ نہ کریں تو بس نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ بزرگان دین یہ فرماتے ہیں:

صوفی نشود صافی تا درنہ کشند جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے(۲)

یہاں تو بسیار سفر بھی نہیں ہے نہایت ہلکا کام ہے غرض یہ طریقہ ہے نماز میں جی لگانے کا جو بطور تفریع کے یہاں بیان کیا گیا لیکن یہ طریقہ محض جاننے کے لئے نہیں ہے بلکہ عمل کرنے کے واسطے ہے، علوم اگر بہت سے حاصل کر لیے جائیں اور عمل نہ کیا تو وہ علوم کسی کام کے نہیں ہیں۔

علم کے فوائد

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے جس شخص کو علوم بہت سے حاصل ہوں اور عمل نہ کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سپاہی ہو اس کے پاس بہت سے ہتھیار ہوں اس کو راہ میں دشمن ملے اور مقابل ہوا لیکن وہ اس اسلحہ کا استعمال نہیں کرتا تو کیا دشمن پر غالب ہوگا۔ یہ علوم بمنزلہ ہتھیاروں کے ہیں، شیطان کے دفع کرنے کے لئے ہتھیار بھی کیسے بلا لائسنس کے مگر صرف ہتھیاروں کے لگانے سے خوش نہ ہونا چاہیے اکثر لوگ بزرگوں سے سن کر یا کتابیں دیکھ کر کچھ طریقے وصول الی اللہ یاد کر لیتے ہیں اور ان پر ان کو ناز ہے لیکن جب ان پر عمل ہی نہ کیا تو کیا

(۱) کتاب پیشاب کر رہا تھا (۲) ''صوفی جب تک مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے، پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے''۔

فائدہ ایسے ہی لوگوں کے لئے ارشاد ہے: ﴿فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ﴾(۱) ''جو علم ان کو حاصل ہے اس سے بہت خوش ہیں'' اگر کوئی خارش والا خارش کے بہت سے نسخے یاد کرلے تو اس سے کیا نفع جب تک کہ ان کو کوٹ پیس کر کام میں نہ لایا جائے۔ پس جب آپ کو یہ طریقہ نماز میں دل لگانے کا معلوم ہوگیا تو آج عصر ہی کے وقت سے اس پر عمل شروع کردو۔ الحاصل یہ ایک تفریع مفید تھی اس پر کہ (النفس لا تتوجه الى شيئين فى آن واحد) ''نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا'' اور مقصود مقام یہ ہے کہ شغل مع غیر اللہ مانع طریق ہے(۲) پس اس رکوع میں ان موانع(۳) کی فہرست ہے اور وہ دو کلیوں میں منحصر ہے ایک وہ حالت جو بہت ناگوار ہو، دوسری وہ کیفیت جو زیادہ گوارا ہو اس لئے جو شئے کم گوارا ہو وہ قلب کو مشغول نہیں کرتی۔ مثلاً آپ کچھ کام کررہے ہیں، عین مشغول حالت میں کسی مچھر نے کاٹ لیا یا عین کام کے وقت آپ نے ایک چنے کا دانہ اٹھا کر کھالیا۔ تو یہ دونوں حالتیں کام کو مانع نہ ہوگی(۴)۔ مانع وہ حالت ہے جو زیادہ ناگوار ہو یا وہ حالت جو زیادہ گوار ہو۔ جو زیادہ ناگوار ہو وہ مصیبت کہلاتی ہے اور جو زیادہ گوار ہو وہ نعمت ہے پس قلب کو مشغول کرنے والی دو چیزیں ہوئیں مصیبت اور نعمت لیکن ان کی ذات مانع نہیں ہے بلکہ مانع اس وقت ہے جب کہ قلب ان سے متاثر ہو۔

رفع اشکال

پس مصیبت اور نعمت کا ہر درجہ مانع نہیں ہے یہاں سے ایک اشکال رفع ہوگیا، تقریر اشکال کی یہ ہے کہ جب نعمت اور مصیبت مانع ہیں تو مصائب تو صلحاء

(۱) سورۃ المؤمن: ۸۳ (۲) غیر اللہ کی طرف مشغول ہونا اللہ تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے (۳) رکاوٹوں (۴) کام میں رکاوٹ نہیں ہوں گی۔

اور اولیاء وانبیاء پر بہت آئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: (اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل)(۱) ''بلاؤں میں سب سے زیادہ حضرات انبیا علیہم السلام مبتلا ہوئے'' اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر دنیوی نعمتیں بھی بہت فائض ہوتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ﴾(۲) تو اگر مصیبت اور نعمت شاغل ہیں تو انبیاء کے لئے بھی شاغل ہوں گی۔ جواب یہ ہے کہ نعمت اور مصیبت کی ذات شاغل نہیں ہے بلکہ ان سے متاثر ہونا مانع ہے۔

محبت ورحمت

انبیاء علیہم السلام کو تاثر اس درجہ کا نہ ہوتا تھا کہ مصیبت ان کو خدائے تعالیٰ سے مشغول کردے یہ تو نہ تھا کہ ان کو مصیبت سے تالم اور نعمت سے تلذذ نہ ہوتا تھا(۳) بلکہ ان کو ہم سے بھی زیادہ ہوتا تھا لیکن خدا تعالیٰ کی یاد سے ان کو غفلت نہ ہوتی تھی ہم لوگوں کو ہوجاتی ہے، اولاد کے ساتھ ان کو ہم سے زیادہ انس تھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور ﷺ منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے حضرت حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بچے سے تھے، بڑے بڑے کرتے پہنے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر سے دیکھا کہ الجھلے پلجھے گرتے پڑتے آرہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ چھوڑ کر ان کو اٹھا کر گود میں لے لیا اور یہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ''تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں'' مجھ کو دیکھ کر صبر نہ آیا۔ ایک مرتبہ ایک رئیس نجد کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے آپ حضرت حسن کو یا

(۱) کنز العمال: ۳۲۵۳، اتحاف السادۃ المتقین: ۱۶:۵ (۲) ''اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور اولاد بھی دی'' سورہ الرعد: ۳۸ (۳) مصیبت سے درد نہ ہوتا ہو اور نعمت سے مزہ نہ آئے۔

حسین کو پیار کررہے تھے اس رئیس نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے تو دس بیٹے ہیں میں تو ایک کو بھی پیار نہیں کرتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کیا کروں، اگر حق تعالیٰ نے تمہارے دل سے رحمت ہی نکال لی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے استغناء کو پسند نہیں فرمایا، آج اگر کوئی مولوی ملا منبر پر سے اتر کر کسی بچے کو لے لے تو لوگ بدنام کردیں۔

شان بزرگان

میں اس وقت دیکھتا ہوں کہ جو چیزیں شریعت میں ناجائز ہیں لوگ اس کو بہ کثرت جائز سمجھتے ہیں اور جو جائز ہیں ان کو ناجائز سمجھتے ہیں وظیفہ پڑھنے کی حالت میں بولنا حرام سمجھتے ہیں۔ خواہ شرعاً کتنا ہی ضروری کام بولنے کا ہو لیکن بولتے نہیں اگر کوئی کچھ کہے گا تو ہوں ہوں کریں گے لیکن زبان سے بولنا حرام ہے، وظائف بہت پڑھتے ہیں لیکن لوگوں کو ستاتے ہیں، اپنی وجاہت سے دباؤ ڈال کر لوگوں سے کام لیتے ہیں، دعوتیں کھاتے ہیں اگر اس غریب کے ہاں کھانے کو بھی نہ ہو مناسب تو یہ ہے کہ ایسے غریب آدمی کی دعوت منظور بھی نہ کرے۔ اودھ میں ایک بزرگ تھے، کسی تعلق دار کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، ایک غریب آدمی ان کا معتقد تھا اس نے عرض کیا کہ حضرت آج مسی کسی روٹی میرے ہاں کھالیجئے۔ ان بزرگ نے منظور فرمالیا وہ شخص پانچ روپے ماہوار کا نوکر تھا۔ وہ ایک مرغ لایا اور چاول وغیرہ خرید کئے، پانچ روپیہ ایک دن میں خرچ کر ڈالے، ان بزرگ کو خبر ہوئی اس کو بلایا اور فرمایا بھائی تم سے ہماری مسی روٹی (۱) کی ٹھہری تھی، یہ تکلفات تم نے کیوں کئے؟ اس نے کہا حضرت جی یونہی کہہ دیا کرتے ہیں، فرمایا کہ بھائی ہم

(۱) چنے کے آٹے کی بنی ہوئی روٹی۔ یعنی سوکھی بھوسی روٹی۔

نہ کھائیں گے ہم کو مسی روٹی کھلاؤ گے تو کھائیں گے، یہ سب چیزیں ابھی واپس کرآئیں اور مسی روٹی پکوائیں، لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کا کیا حرج تھا کیوں واپس کرادی، فرمایا کہ بے چارے کی کل پانچ روپیہ تو تنخواہ ہے اگر آج ہی یہ صرف کردیتا ہے تو مہینہ بھر اس کے بال بچے بھوکے رہتے، میری جان کو کوستے، شب کو وہ غریب حسب الحکم مسی روٹی لایا اتنا اس نے اضافہ کردیا کہ گھی سے چپڑ دی اس پر شاہ صاحب نے کچھ انکار نہیں کیا، فرمایا جب ان تعلق دار صاحب کے یہاں دسترخوان پر قسم قسم کے کھانے آئے اور سب دوست احباب جمع ہوگئے لوگوں نے چاہا شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں اور عمدہ کھانا کھلادیں، اول ایک نے کہنا شروع کیا کہ حضرت کچھ تبرک ہم کو بھی عطا ہو، دوسرا بولا کہ حضرت میرا بھی بہت جی چاہتا ہے، بزرگوں کو حق تعالیٰ نے فراست صحیحہ عطا فرمائی ہے سمجھ گئے یہ مل کر میری روٹی اڑانا چاہتے ہیں انہوں نے اس میں سے ایک روٹی دے کر فرمایا کہ اس کو بانٹ لو زیادہ کسی کو ایک ٹکڑا بھی نہ دوں گا، غرض انہوں نے وہی روٹی اس جگہ بیٹھ کر کھائی، بزرگوں کی یہ شان ہوتی ہے۔

آج کل کے بزرگ

آج کل کے بعضے بزرگ اور مولوی صاحب کھانے کے بزرگ اور مولوی ہیں۔ مولوی ہونا گویا اپاہج ہوجانا ہے، گھر کے کام کاج کو ہاتھ نہیں لگاتے اس لئے کہ حضرت بن گئے ہیں۔ اگر گھر کا سودا سلف خرید کردیں گے تو ان کی بزرگی میں فرق آجائے گا حالانکہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان یہ تھی (لیوث النھار ورھبان اللیل) یعنی دن کو اگر کوئی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھتا تھا تو سمجھتا تھا کہ شیر ہیں اور رات کو راہب بن جاتے تھے کہ شب بیداری میں گزارتے تھے۔ اب تو یہ

حالت ہے کہ ذرا کوئی تہجد پڑھنے لگے تو پیر بننے کے مدعی ہوجاتے ہیں اور اگر دو چار مرید ہوگئے تو وہ بنانا شروع کردیتے ہیں اور کاروبار سے تو بالکل ہی معطل ہوجاتے ہیں اگر پیاس ہوتو پیاسے بیٹھے رہیں گے یہ نہیں کہ خود اُٹھ کر پانی پی لیں کہیں گے کوئی ہے؟ یہ خدام حضرت جی حضرت جی کہہ کر مزاج بگاڑ دیتے ہیں۔مولانا فرماتے ہیں:

نفس از بس مدحہا فرعون شد کن ذلیل النفس ہونا لاتسد(۱)

فی الواقع شہرت بہت بری بلا ہے دین کے لئے تو مضر ہے ہی، دنیا میں بھی اس کی بہت آفات ہیں جیسے مولانا فرماتے ہیں:

چشمہا و خشمہاؤ اشکہا برسرت ریز وچو آب از مشکہا

یعنی لوگوں کے غصے اور چشم بد اور غبطے ورشک تیرے سر پر اس طرح برستے ہیں جیسے مشکوں سے پانی گرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا بننا بہت مشکل ہے آج کل کے بزرگ شاہ صاحب نہیں، سیاہ صاحب ہیں۔ بزرگوں کی یہ شان ہوتی ہے جیسا ان بزرگ نے کیا کہ تمام سامان اس غریب کا واپس کرادیا اور دعوت میں مسی روٹی پکوائی اور باوجود اس کے کہ اودھ میں تہذیب بہت ہے کہ جس کو تعذیب کہنا مناسب ہے لیکن انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی اور وہی روٹی کھائی۔

تعظیم اور تہذیب

ہمارے ان قصبات میں الحمدللہ ایسی تہذیب نہیں ہے سادگی ہے برتاؤ میں، بات چیت میں ہر امر میں سادگی ہے، میرے پاس ایک گاؤں کا آدمی آیا کرتا تھا، سلسلہ میں داخل تھا، ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگا کہ ہمارے گاؤں میں ایک فقیر آیا کرتا ہے میں اس کا طالب ہوجاؤں؟ میں نے اس کو دھمکایا اس لئے کہ وہ فقیر پابند

(۱) ''نفس بہت سی تعریفوں سے فرعون ہوگیا، ذلیل نفس بنو اور اس کی خودروی بند نہ کرو''۔

شریعت نہ تھا، ایک مدت کے بعد میں نے پوچھا کہ اب کس کے طالب ہو؟ سادگی سے کہنے لگا کہ بس اب تو تیرا ہی پلہ پکڑ لیا ہے مجھے اس کی زبان سے یہ بات ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ میں نے اس سے کئی مرتبہ یہ ہی بات کہلائی اودھ میں تو یہ بات ایسی ہے جیسے گولی ماردی اور تعظیم وتکریم کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی آجائے تو نصف قامت کھڑے ہوجاتے ہیں جیسے میاں جی لڑکوں کو سزا دینے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اودھ تشریف لے گئے تھے۔ ایک رئیس نے اسی طرح تعظیم کی۔ مولانا نے انگوٹھا دکھادیا اس نے کچھ نذر پیش کی، مولانا نے منہ چڑادیا، یہ ان کی اس تعظیم وتہذیب مفرط (۱) کا رد تھا اور اس قصہ میں یہ بھی ہے کہ جب وہ غریب مسی روٹی لایا اور ان امراء نے چاہا کہ شاہ صاحب کو یہ روٹی نہ کھانے دیں اور تہذیب کی وجہ سے یہ تو کہہ نہیں سکے کہ حضرت یہ روٹی نہ کھائیے بلکہ یہ کہا کہ حضور ہم بھی تبرک لیں گے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں، بزرگ بھولے نہیں ہوتے ان کو اللہ تعالیٰ فراست اور عقل صحیح عطا فرماتے ہیں۔ انبیاء میں کوئی بھولا نہیں ہوا اگر ایسے ہوتے تو مفسدوں کے مکر اور ان کی چالوں سے کیسے واقف ہوتے ان کے دھوکہ میں آجایا کرتے۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان یہ تھی کہ قیصر کے ہاں جو یہاں کا ایک قاصد گیا تھا اس سے قیصر نے پوچھا کہ تمہارا خلیفہ کیسا ہے تو انہوں نے کہا ان کی شان ہے: (لا یخدع ولا یخدع) یعنی وہ نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہ کسی کے دھوکہ میں آتے ہیں۔ قیصر نے سن کر کہا کہ کسی کو دھوکہ نہ دینے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے دیندار ہیں اور دھوکہ نہ کھانے سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے

(۱) بے جا تعظیم وتہذیب۔

عاقل ہیں اور جس شخص کے اندر یہ دونوں صفتیں ہوں وہ کسی سے مغلوب نہ ہوگا۔ اسی طرح ان صاحب کی حقیقت سمجھ کر کہہ دیا کہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگ یہ روٹی مجھ کو نہ کھانے دوگے، سو یاد رکھو میں کسی کو نہ دوں گا اور وہ روٹی خود انہوں نے کھائی صرف ایک روٹی ان کی درخواست پر دے دی اور یہ جو اس قصہ میں ہے کہ لوگوں نے جب پوچھا کہ حضرت اس میں کیا مصلحت تھی کہ آپ نے سب سامان واپس کرادیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم دیوانے ہوئے ہو، بیچارے کی پانچ روپیہ تو تنخواہ ہے اور وہ سب آج ہی اگر خرچ کر دیتا تو تمام مہینہ بے چارا تکلیف میں رہتا اور اس کے اہل وعیال کوستے وہ اور بال بچے کہتے کہ اچھے بزرگ آئے تھے کہ صفایا ہی کر گئے، اس لئے مشائخ کو چاہیے کہ اپنے متوسلین اور احباب کی رعایت کریں ان کی وسعت سے زائد نذر قبول نہ کریں۔

طبعی راحت وکلفت

مگر اب ان اخلاق کو چھوڑ کر بزرگی اس میں رہ گئی ہے کہ وظیفہ میں بولنا ان کے نزدیک حرام ہے اگر بولیں گے تو وظیفہ ٹوٹ جائے گا ان کا وظیفہ کیا ہوا جولاہے کا دھاگا ہے۔ خدا جانے یہ مسئلہ کس نے تراشا ہے کہ وظیفہ میں بولنے سے وظیفہ ٹوٹ جاتا ہے جس چیز کو خدا نے بولنے سے ٹوٹ جانے کو کہا ہے وہ تو ٹوٹ جاتی ہے جیسے نماز، باقی کوئی شے نہیں ٹوٹتی۔ سو اب بزرگی اس کا نام رہ گیا ہے کہ جس شے میں تنگی کرنا چاہیئے اس میں وسعت کرتے ہیں اور وسعت کی جگہ تنگی۔ بڑا بزرگ وہ ہے کہ اگر گھر میں آگ بھی لگ جائے یا کوئی شخص مرتا ہو تو وظیفہ کو قطع کر کے اس کی مدد نہ کرے۔ یاد رکھو بزرگ وہ ہے جو قدم بقدم ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ پس اولاد کے ساتھ انبیاء کو بہت محبت ہوتی ہے مگر وہ محبت ان کو حق تعالیٰ سے غافل

نہیں کرتی۔ پس معلوم ہوا کہ نعمت اور مصیبت کی ذات مانع نہیں ہے بلکہ وہ درجہ مانع ہے جو افراط کے درجہ میں ہو اور خواص کو کوئی درجہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ ان کو مصیبت میں زیادہ ناگواری اور نعمت میں زیادہ گوارائی ہی نہیں ہوتی بخلاف عوام کے ان کو مصیبت اور نعمت جارفتہ (۱) کر دیتی ہے۔

انبیاء واولیاء کا حال

اس مضمون کو دوسرے عنوان سے سمجھو کہ انبیاء واولیاء کو بلا اور نعمت سے راحت اور کلفت تو ہوتی ہے لیکن وہ راحت اور کلفت طبعی ہوتی ہے ان کو اس میں مبالغہ اور انہماک نہیں ہوتا پس راحت اور کلفت کے دو درجے ہوئے اول طبعی دوسرا درجہ انہماک اور مبالغہ کا کہ بشراشرہ اور باسرہ (۲) اس میں کھپ جائے اور دوسری طرف مطلق دھیان نہ ہو انبیاء واولیاء کو طبعی راحت اور طبعی کلفت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کی وفات ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا اور فرمایا: (انا بفراقك يا ابراهيم لمحزونون) (۳) ''اے ابراہیم میں تمہارے فراق سے غمگین ہوں'' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو جاری ہوئے بعض صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا ہے۔ فرمایا: یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قلب میں رکھی ہے اسی طرح حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو آتے دیکھ کر جوشِ محبت سے ان کو منبر سے اتر کر اٹھالیا لیکن یہ حزن اور محبت طبعی تھی جس کا ادراک خاصہ ہے طبع سلیم کا۔ اگر کسی پر حال غالب ہو تو اس وقت یہ طبعی کلفت اور راحت بھی نہیں ہوتی لیکن انبیاء پر بوجہ ان کے علوی مقام (۴) کے حال غالب نہیں ہوتا وہ اس سے منزہ ہوتے ہیں

(۱) بے خود (۲) مکمل طور پر اس میں کھپ جائے (۳) جامع المسانید: ۲۔۵۷۶ (۴) مقامِ بلند۔

وہ حالت پر خود غالب ہوتے ہیں، غلبہ حال اولیاء متوسطین پر ہوتا ہے جس میں ان کو راحت سے راحت اور کلفت سے کلفت نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی اولاد کا انتقال ہوا۔ وہ ہنس دیئے لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگ بڑے کامل ہیں، کامل ہونے میں ان کے شک نہیں ہاں اکمل نہیں ہیں اکمل وہ ہے کہ جس کی حالت جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو کہ آنسو ٹپک رہے ہوں اور دل من کل الوجوہ اپنے مولا کی قضا پر راضی ہو(۱)۔

تکلیف پر راضی ہونے کی مثال

شاید کسی کو اشکال ہو کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے اس لئے میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں، دیکھو کسی شخص کے دنبل ہوجائے، سول سرجن کو دکھلایا اس نے کہا کہ یہ بغیر شگاف کے صاف نہ ہوگا، اب اس میں مریضوں کی مختلف حالت ہوتی ہے بعض دل کے کمزور ہوتے ہیں ان کو تو کلورافارم سونگھا کر بیہوش کر کے شگاف دیتے ہیں اس وقت اس مریض کو اس چیر پھاڑ کا کچھ الم محسوس نہیں ہوتا اس لئے کہ دوسری شے اس کے حواس پر غالب ہے۔ یہ مثال ان اولیاء اللہ کی ہے جن پر حال ایسا غالب ہوتا ہے کہ ان کو مصیبت کا الم (۲) محسوس نہیں ہوتا اور ایک قوی شخص ہے کہ اس نے کہا کہ مجھ کو بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں، تم بشوق تمام اپنا کام کرو۔ ڈاکٹر نے وہ دنبل تراشا (۳) تراشنے میں اس کو تکلیف بھی ہوگی اور آہ بھی زبان سے نکلے گی اور یاد رکھو یہ آہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے تکلیف میں آہ سے بڑی راحت ہوتی ہے یہ آہ مصیبت کی مقلل ہے (۴) غرض اس زخم کے تراشنے

(۱) دل اللہ کے فیصلے پر مکمل راضی ہو (۲) مصیبت کا درد (۳) پھوڑے میں چیرا لگایا (۴) تکلیف کو کم کرنے والا ہے۔

کے وقت اس مریض کا منہ بھی بنجاوے گا لیکن وہ دل سے راضی ہے، کاٹنے والے سے ذرا بھی اس کے دل میں کدورت نہیں ہے۔ چنانچہ جب وہ زخم صاف ہوگیا تو جراح کہتا ہے لائیے انعام، فوراً جیب سے نکال کر دس روپیہ اس کی نذر کئے اور اب وہ جھگڑ رہا ہے کہ حضور بہت کم ہے اور دیجئے اس نے دس روپیہ اور نکال کر دیئے۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ ایک تو اس نے مصیبت میں ڈالا پھر اس کو انعام دیا جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اس زخم پر راضی تھا۔ سو بظاہر یہاں بھی وہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اگر راضی تھا تو ناک منہ کیوں چڑھایا اور اگر ناراض تھا تو انعام کیوں دیا؟ وہ بھی جواب دے گا کہ کلفت طبعیہ کی وجہ سے تو ناک منہ چڑھایا اور دل سے راضی تھا کہ اس کا انجام بہتر ہے۔ یہ مثال عبادالمکین کی ہے کہ ان کو مصیبت میں طبعی کلفت اور رنج ہوتا ہے اور دل چونکہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں حکمت اور مصلحت میرے مولا کی ہے اس لئے راضی ہے اعتراض یا کدورت یا انقباض(۱) نام کو بھی نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ شخص بڑا قوی دل ہے کہ باوجود ہوش وحواس کے پھر بھی از جارفتہ نہیں ہوا اور اپنے خیر خواہ معالج سے اس کو کچھ انقباض نہیں ہوا اگر جاہل اور نادان ہوتا تو ضرور اس کا دل مکدر ہوجاتا اور وہ شخص جس کو بیہوش کیا گیا ہے وہ درجہ میں اس سے کم ہے۔ سول سرجن جانتا ہے کہ اگر ہم اس کو بیہوش نہ کریں گے تو بہت شور مچاوے گا اور ہم کو کام نہ کرنے دے گا پس جن کو غلبہ حال کا کلورافارم سنگھادیا گیا ہے وہ درجہ میں ان حضرات سے کم ہیں اور یہ امر بہت ظاہر ہے اس لئے شریعت نے رضا بالقضاء کا حکم کیا ہے۔ التذ اذ بالقضاء(۲) کا حکم نہیں کیا

(۱) کسی قسم کا اعتراض یا ناپسندیدگی بالکل نہیں ہوتی (۲) قضاء الٰہی پر راضی رہنے کا حکم دیا ہے اس فیصلہ سے لذت حاصل کرنے کا حکم نہیں دیا۔

اور مشائخ کے کلام سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ چنانچہ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں۔ وگر تلخ بینم درکشید (اگر تلخ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں) معلوم ہوا کہ تلخی کا تو احساس ان کو ہوتا ہے لیکن اس سے راضی ہیں۔ قضا کے سامنے بولتے نہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من(۱)

معلوم ہوتا ہے کہ دل رنجانی ہوتی ہے(۲) لیکن وہ خوش ہے بہرحال رضا بالقضاء کلفت طبعیہ کے ساتھ جمع ہوجاتی ہے(۳) اور جن کو اس میں لذت ہوتی ہے کلفت نہیں ہے وہ صاحب کمال نہیں ہے۔

کامل کی شان

صاحب کمال کی پہچان یہ ہے کہ اس کا حال انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہو۔ دیکھو! حضرت یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کے فراق میں کیا حال ہوا کہ روتے روتے آنکھیں مبارک سفید ہوگئی تھیں جیسا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿یٰٓاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ﴾(۴) جب بیٹوں نے یہ حال دیکھا تو کہا: ﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِیْنَ﴾(۵)۔ یعقوب علیہ السلام نے سبحان اللہ کیا، جواب ارشاد فرمایا ہے، فرماتے ہیں: ﴿قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ

(۱) ''محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر میرے لئے پسندیدہ ہے۔ میں اپنے محبوب پر اپنی جان اور دل قربان کرتا ہوں جو میری جان کو رنج دینے والا ہے'' (۲) دل برا ہوتا ہے (۳) طبعی پریشانی کے باوجود اللہ کے فیصلہ پر راضی رہا جاسکتا ہے (۴) ''کہا اے افسوس یوسف پر اور اس کی آنکھیں سفید ہوگئی'' (۵) ''یعنی بیٹوں نے کہا کہ قسم اللہ کی (اے ابا) تم تو ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتے رہو گے یہاں تک کہ سخت مریض ہوجاؤ گے یا بالکل ہلاک ہوجاؤ گے''۔ سورہ یوسف: ۸۵۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾(۱) یہ وہی مضمون ہے ہم درتو گریزم۔ دیکھئے ماں جب بچے کو مارتی ہے تو وہ روتا ضرور ہے لیکن رو کر پھر ماں ہی کو لپٹ جاتا ہے۔ بس بڑا کمال ان اولیاء اللہ کا ہے کہ ان کو غم محسوس ہو اور از جارفتہ نہ ہوں(۲) اور اس شخص کی کیا ہمت ہے کہ ادھر سے ان کو ایسی لذت دی گئی ہے کہ اس کے غلبہ میں سب بھول گئے اور جو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ﴿وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾(۳) مطلب یہ ہے کہ بث اور حزن کا راز تم کو معلوم نہیں ہے وہ مجھ کو معلوم ہے یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ کاملین کی حالت کا اندازہ عوام اور ناقصین بلکہ متوسطین بھی نہیں کر سکتے۔ مولانا فرماتے ہیں:

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نبشتن شیر وشیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسے زابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایں شاں بشر ماؤ ایشاں بستہ خوابیم وخور(۴)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کاملین بظاہر عوام مؤمنین کے مشابہ ہوتے ہیں ان میں کوئی امتیازی نشان نہیں ہوتی اس لئے ان کے مراتب کا ادراک ہر ایک کو نہیں ہوسکتا۔ ظاہر حال ان کا اور عوام کا یکساں ہوتا ہے پھر کیسے کوئی پہچانے۔ ہاں جو صاحب بصیرت ہے اس کو ادراک ہوتا ہے پس صورت عوام کے مشابہ اور حقیقت متفاوت، جیسے کسی بزرگ نے حضرت حق سے ناز کر کے پوچھا تھا کہ اے اللہ فرعون

(۱) ''تو اپنے رنج وغم کا اپنے اللہ سے شکوہ کرتا ہوں اور میں اپنے اللہ کے یہاں کی وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے'' سورۃ یوسف:۸۶ (۲) بے قابو نہ ہوں (۳) ''میں اللہ کے یہاں کی وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے'' سورۃ یوسف:۸۶ (۴) ''بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں یکساں ہیں جیسے شیر وشیر یکساں ہیں تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں اور کہنے لگے کہ ہم بھی انسان ہیں وہ بھی انسان ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں''۔

نے ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی﴾(۱) کہا اور منصور نے (انا الحق) ''میں حق ہوں'' کہا دونوں کا ایک ہی مدلول ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ایک مردود ہوا اور دوسرا مقبول۔ ارشاد ہوا کہ فرعون نے (اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی) ''میں تمہارا بلند مرتبہ رب ہوں'' ہمارے مٹانے کو کہا تھا۔ اس لئے ملعون ہوا اور منصور نے (انا الحق) ''میں حق ہوں'' اپنے مٹانے کو کہا۔ اس لئے مقبول اسی مضمون کو مولانا فرماتے ہیں:

گفت فرعونے انا الحق گشت پست گفت منصورے انا الحق گشت مست

رحمۃ اللہ ایں انا را دروفا لعنۃ اللہ آں انا را در قفا(۲)

منصور کے (انا الحق) کے معنی یہ تھے کہ انا کوئی شے نہیں جس کو انا کہا جاتا ہے وہ بھی حق ہے اور فرعون کے (انا الحق) کے معنی یہ ہیں کہ حق جس کو کہا جاتا ہے وہ انا (میں) ہی ہوں سوائے میرے کوئی حق نہیں ہے۔ یہاں بھی صورت دونوں قول کی یکساں اور معنی متفاوت۔ غرض انبیاء مغلوب نہیں ہوتے لیکن رضا میں کامل ہوتے ہیں اور مغلوب نہ ہونے کے سبب انبیاء کو مصیبت میں لذت نہیں ہوئی اور جن پر حال غالب تھا ان کو مصیبت میں کلفت نہیں محسوس ہوئی بلکہ لذت اور مزہ آیا اور تیسرا وہ عوام ہے کہ ان کو مصیبت میں الم اس قدر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس میں کھپ جاتے ہیں اور دوسری جہت مقابل یا تو بالکل گم ہو جاتی ہے یا مغلوب ہو جاتی ہے اور بعضوں کی بلکہ اکثر کی زبان سے شکوہ اور شکایت بھی اپنے مولا کا نکلتا ہے عوام کی مصیبت ان کا جیل خانہ ہے اور خواص کے لئے زخم کا نشتر ہے عوام مصیبت میں اسی کا سبق لے کر بیٹھ جاتے ہیں جس کا کوئی حاصل نہیں۔ سو ایسا نہ کرنا چاہیے

(۱) ''میں تمہارا بلند مرتبہ رب ہوں'' (۲) ''فرعون نے انا الحق کہا مردود ہوا، حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ نے انا الحق کہا مقبول ہوئے، وفا میں انا اللہ کی رحمت ہے اس انا کے پیچھے اللہ کی لعنت ہے''۔

بلکہ مومن کو چاہیے کہ جو معالجات اور آداب ہر مرض اور ہر حال کے متعلق حق تعالیٰ نے ہم کو ارشاد فرمائے ہیں ان پر عملدرآمد کرے اس لئے کہ کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کا علاج ہم کو نہ بتلایا گیا ہو۔

درد ازیارست درماں نیز ہم دل فدائے اوشدوجاں نیز ہم(۱)

حقوق مصائب

اب دیکھنا چاہیے کہ مصیبت کے کیا حقوق ہم پر لازم کیے گئے ہیں سو ارشاد ہے: ﴿اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ یعنی ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں۔ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (۲) لیکن یہ مراد نہیں ہے کہ صرف زبان سے (اِنا للّٰہ) الخ کا وظیفہ پڑھتے رہیں۔ حضرت اگر نرا وظیفہ پڑھنا مراد ہوتا اور کوئی مناسبت آپ کے حال سے ان کلمات کو نہ ہوتی تو رکوع میں (سبحان ربی العظیم) ''پاک ہے میرا رب عظمت والا'' اور سجدہ میں (سبحان ربی الاعلیٰ) ''پاک ہے میرا رب برتری والا'' کہنے کی خصوصیت نہ ہوتی، دونوں میں ایک قسم کا ذکر مشروع ہوتا۔ یہ ضروری ہے کہ (سبحان ربی العظیم) کو رکوع کی حالت سے مناسبت ہے اور (سبحان ربی الاعلیٰ) کو سجدہ کے ساتھ تعلق خاص ہے جن کی وجہ سے دونوں میں تفاوت ہوا اور وہ بظاہر یہ ہے کہ سجدہ میں پستی زیادہ ہے کہ اشرف الاعضاء کو اخس الاشیاء کے ساتھ ملحق کر دیا ہے (۳) حالت مقتضی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفت زیادت علو کو (۴) مستحضر کیا جائے جو

(۱) ''درد بھی محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی محبوب کی طرف سے ہے، دل اور جان میری اس پر فدا ہے'' (۲) ''ہم سب اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں'' (۳) اعضاء میں جو سب سے افضل عضوء یعنی پیشانی تھی اس کو سب سے پست چیز یعنی زمین پر لگا دیا (۴) اللہ کی زیادہ بلندی کا استحضار کیا جائے۔

مدلول ہے افعل التفضیل کا کہ وہ پاک ذات سب سے برتر ہے اور رکوع میں بہ نسبت سجدہ کے پستی کم ہے اس لئے اس حالت میں نفس عظمت کا استحضار مناسب ہوا کہ صیغہ فعیل افعل کی طرح نہیں ہے معنی تفضیل میں۔ پس معلوم ہوا کہ نرا وظیفہ پڑھنا مراد نہیں ہے بلکہ دل سے اس کو سمجھ کر اس سے متاثر ہونا مقصود ہے۔ اسی واسطے ہر قول کی نسبت ارشاد ہے: ﴿قُلْ لَّهُمْ فِيْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا﴾ کہ آپ ان کو ایسی بات فرمائیے کہ جو مؤثر ہو اور بات تو وہی ہے جس کا منشاء قلب ہو۔ جیسا شاعر کہتا ہے:

ان الكلام لفي الفواد وانما جعل اللسان على الكلام دليلا

یعنی کلام تو دل میں ہے اور زبان تو کلام کی نری ترجمان ہے بس (قالوا) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قالوا باللسان بلکہ یہ ہیں (قالوا من انفسهم) یعنی اپنے دل سے کہتے صرف زبان سے نہیں کہتے۔ آپ شاید اس کو سن کر یہ سمجھے ہوں گے کہ دل میں یہ وظیفہ پڑھ لیں گے۔ یعنی الفاظ کا خیال کر لیں۔ افسوس

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

قرآن کا اعجاز

یاد رکھو کہ نرا دل کا فعل بغیر سمجھے بھی کام کا نہیں، حق تعالیٰ اس کی بھی شکایت فرماتے ہیں: ﴿وَلَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا﴾ یعنی ان کفار کے لئے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں۔ پس دل سے کہنا بے معنی تخیل و تصور الفاظ بھی کار آمد نہیں ہے بلکہ مضمون کا فہم شرط ہے۔ اس لئے ہم اس کی شرح بقدر ضرورت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت کہتے ہیں انا للہ یعنی دل سے اپنے یقین رکھتے ہیں کہ ہم اللہ کی ملک ہیں سبحان اللہ کیا تعلیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ امر ثابت ہے کہ ہم سب اللہ کی ملک ہیں اور ملک اور قبضہ و تصرف کا کوئی حصہ ہمارا

نہیں تو اگر مالک اپنی کسی شے کے اندر تغیر تبدل کرے اور اپنی ایک مملوک چیز کو اپنی دوسری مملوک چیز سے جدا کر دے تو یہ امر قابل اعتراض ومزاحمت نہیں ہے۔ دیکھئے اگر آپ کی ملک میں ایک الماری ہے اور اس میں کچھ کتابیں رکھی ہیں اگر آپ ان کتابوں کی ترتیب بدل دیں کہ ان میں ایک کتاب کو کسی دوسرے خانہ میں رکھ دیں تو وہ کتاب جس سے علیحدہ کیا ہے یہ نہیں کہہ سکتی کہ میری بہن کو علیحدہ کیوں کر دیا اور نہ کوئی اور کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی جگہ کیوں بدل دی۔ پس اگر ہمارا مالک ہمارے کسی عزیز کو ہم سے علیحدہ کر کے دوسرے جہاں میں منتقل کر دے تو ہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ چوں وچرا کریں۔ وہ مالک ہیں (یتصرف فینا کیف یشاء)(۱) پس مومن کو چاہیے کہ ان کے معنی کو سمجھ کر تسلی حاصل کر لے اور واقعی اگر یہ مضمون قلب میں راسخ ہو جائے (۲) تو مادہ غم کو بیخ سے (۳) کاٹنے والا ہے اس کے ہوتے ہوئے رنج اور حسرت کا نام نشان نہیں رہ سکتا۔ دیکھئے یہ ہے تعلیم اسلامی کہ بقراط اور سقراط اور جہان بھر کے فلاسفہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اگر کوئی مدعی ہو تو بتلائے کہ اس کے سوا کون سی تدبیر ہے کہ جس سے انسان کو تسلی حاصل ہو اور گو اس قدر جملہ بھی مصیبت کا اثر دور کرنے کے لئے کافی تھا لیکن یہ اس شخص کے لئے ہے کہ توحید کے اندر اس کا قدم راسخ اور اعتقاد کے ساتھ حال بھی میسر ہو اور جو اس مرتبہ کا نہ ہو اس کے دل میں خیال گزر سکتا ہے کہ اس پر تو ہمارا ایمان ہے کہ ہم سب اللہ کے ہیں اور نہ ہم کو حق چوں وچرا کا ہے لیکن چونکہ ہمارا بیٹا یا عزیز ہم سے جدا ہو گیا ہے اس کا رنج ہمارے دل کو پاش پاش کر رہا ہے اور اس کی مفارقت (۴) دائمی ہم کو ستا رہی ہے اس کا کیا علاج۔

(۱) ہم میں جیسے چاہیں تصرف کریں (۲) دل میں جم جائے (۳) غم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا (۴) جدائی ہمیشہ کے لئے ہونا۔

عوام کی تسلی کا سامان

اس لئے اس پر (وانا الیہ راجعون) بھی بڑھادیا گیا ہے یعنی ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔ مطلب ہے کہ اگر تم کو بہت ہی بے قراری ہے اور وہی شے تمہارا مطلوب ہے اور اس کے بغیر تم کو چین نہیں آتا تو تم اپنے نفس سے کہو کہ ہم سب اسی طرف جانے والے ہیں وہاں سب ایک دوسرے سے مل لیں گے اور حیات دنیوی کا زمانہ وہاں رہنے کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اب گزر جائے گا جب یہ مضمون پیش نظر ہوگا اور یقین کامل اس کا ہوجائے گا تو پوری تسلی اور راحت اس کو حاصل ہوجائے گی۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز معنوی اور یہ ہیں اس کی تعلیمات آج کوئی دکھلائے تو کہ ایسی تعلیم کہاں ہے اور تمام تعلیم یافتہ اور فلاسفر جمع ہوکر بتلائیں کہ اس کے سوا کون سا طریقہ ہے تسلی کا اور کچھ اسی باب میں یہ تعلیم نادر نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی تمام تعلیمات ایسی ہی ہیں واللہ الحمد میں بقسم کہتا ہوں کہ جس کا قرآن وحدیث پر ایمان نہیں ہے یا ایمان میں ضعف ہے اس کی راحت اور تسلی کا کوئی طریقہ ہی نہیں اور قرآن مجید کی ہر ہر تعلیم اور ہر ہر ادا ایسی ہے کہ بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے:

زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست (۱)

یہ حق ہے مصیبت کا کہ جو ہم کو تعلیم کیا گیا ہے اس حق کے ادا کرنے والے کو ناگواری رہ ہی نہیں سکتی۔ دیکھو اگر ہم کو یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں عزیز حیدرآباد کا وزیراعظم ہوگیا ہے کہ ہم بجائے اس کے کہ اس کی جدائی کا رنج ہو خوشی ہوگی

(۱) ''سر سے پیر تک جس طرف نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے یعنی اس کا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے''۔

اور شوق ہوگا کہ کسی طرح ہم بھی وہاں پہنچیں، اسی طرح معتقد آخرۃ(۱) کو وہاں جانے کا شوق ہونا چاہیے اور جو وہاں پہنچ گئے ہیں ان پر خوش ہونا چاہیے کہ اچھا ہوا کہ دنیا کے قید خانہ سے ان کو رہائی ہوئی۔ بعضے بزرگوں پر اس درجہ یہاں کے چھوٹنے کا شوق ہوا ہے انہوں نے اس کی تمنا کی ہے چنانچہ بعض ان میں سے کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے تادر میکدہ شادان وغزل خواں بروم (۲)

میکدہ اصطلاحی لفظ ہے اس سے مراد مقام قرب ہوتا ہے اور بعض مرتبہ میکدہ سے راہ محبت وعشق اور کعبہ سے طریق زہد وعبادت بھی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ اے پیررہ بگو کہ طریق صواب چیست (۳)

غرض اس مضمون کو سمجھنے کے بعد غم بالکل جاتا رہے گا اور اگر اب بھی رہے تو سمجھ لو کہ اس مضمون کا اس کو یقین ہی نہیں ہوا اور وہ غم کے اندر اپنی عمر فضول ضائع کر رہا ہے جس سے کوئی حاصل نہیں۔ اس لئے کہ وہ محبوب سے ملے گا تو ہے نہیں۔ جیسا عرفی کا شعر ہے:

عرفی اگر بگریہ بمیسر شدے وصال صد سال می تواں بتمنا گریستن (۴)

محبت کا تقاضا

صاحبو! اگر آپ کا محبوب کوئی آپ کی چیز لے لے تو وہ محبوب اگر آپ کا

(۱) آخرت کا یقین رکھنے والے کو (۲) ''وہ دن بہت اچھا ہوگا کہ اس ویرانہ مکان یعنی دنیا سے جاؤں، جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کے لئے چلا جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہوجائے تو خوش وخرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں'' (۳) ''مدرسہ سے طریق زہد اختیار کروں یا طریق عشق اے پیر راہ بتلا کہ کون سا طریق مناسب ہے'' (۴) ''عرفی اگر رونے سے وصال محبوب میسر آجائے تو میں سو برس تک اس کی تمنا میں رو سکتا ہوں''

محبوب ہے تو آپ کچھ بھی چوں و چرا نہیں کریں گے بلکہ خوش ہوں گے اور اگر چوں و چرا کرو تو معلوم ہوا کہ وہ محبوب آپ کو محبوب نہیں بلکہ وہ شے محبوب ہے بلکہ محبت کا مقتضی تو یہ تھا کہ آپ روئیں بھی نہیں مگر اس پر یہ شبہ آپ کریں گے کہ انبیاء بھی تو مصیبت میں روئے ہیں جیسا کہ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رونا صاحبزادہ کے انتقال پر مذکور ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے رونے اور ان حضرات کے رونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے ہم تو محض اس شے کی یاد میں روتے ہیں اور وہ حضرت دیکھتے ہیں کہ اس وقت حضرت حق کو ہمارا رونا ہی مطلوب ہے کہ دلیل افتقار ہے(۱) اس لئے روتے ہیں سو آپ کو بھی رونے کی اجازت ہے اس محبوب شے کا لے لینا خود دلیل ہے اس کی، کہ محبوب حقیقی کو مصلحت کے لئے تمہارا رلانا بھی منظور ہے سو روؤ لیکن حدود کی رعایت رکھو کہ اس محبوب شے کو محبوب حقیقی سے مت بڑھاؤ کہ اس کا ہی وظیفہ کرلو، بس رو رلا کر پھر محبوب حقیقی کی یاد میں مشغول ہو جاؤ، اگر بالکل نہ روئے تو بھی آپ نے اس مصیبت کے راز کو نہ سمجھا اور اگر ساری عمر روتے رہے اور اسی کو لے لیا تو مالک حقیقی آپ کا محبوب نہ ہوا، خدا کے سامنے روؤ، اس کے دھلانے کو روؤ تا کہ افتقار اور عجز تمہارا ظاہر ہو، خدا سے دوسروں کے سامنے روؤ، جو اس راز کو سمجھ گئے ہیں وہ روئے بھی ہیں۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

کیں تضرع را برحق قدر ہاست　　کان بہا کا نجاست زاری را کجاست
گر تو خواہی کز بلا جاں وآخری　　جان خود در او تضرع آوری
اے خوشا چشمے کہ آن گریاں اوست　　اے خوشا آں دل کہ آن بریان اوست (۲)

(۱) عاجزی کی دلیل ہے (۲) ''اس گریہ وزاری کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت قدر ہے جو قیمت اس کی دربارِ خداوندی میں ہے وہ گریہ وزاری کہاں ہے۔ اگر بلا سے چھٹکارا چاہتے ہو تو اپنی جان کو گریہ وزاری میں لاؤ، وہ آنکھ بہت اچھی ہے جو محبوب کی جدائی میں رونے والی ہے اور وہ دل بہت اچھا ہے جو محبوب کی محبت میں بریاں ہے''۔

پس جو مصیبت میں اس کے رلانے سے روتے ہیں وہ بھی گریاں اوست میں داخل ہیں رونا اور مصیبت دونوں بڑی نعمت ہیں کہ اس میں بندہ کا افتقار ظاہر ہوتا ہے پس جو نہ روئے اور ضبط کر کے پتھر سا بنا رہے اس نے مراد حق کو پورا نہ کیا۔ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار ہوئے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے، فرمایا اچھی نہیں بیمار ہوں۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ تو بڑے عارف ہیں جزع فزع کرتے ہیں، فرمایا کہ دیوانے ہو کیا؟ میں اپنے خدا کے سامنے بہادر بنوں کہ وہ تو میرا ضعف ظاہر کریں اور میں قوت ظاہر کروں۔ ایک بزرگ رو رہے تھے کسی نے پوچھا آپ کیوں رو رہے ہیں، فرمایا کہ بھوک لگ رہی ہے اس شخص نے کہا حضرت آپ بھوک میں روتے ہیں، فرمایا کہ محبوب حقیقی جب ہمارے رونے ہی کو بھوک لگا دیں تو ہم کیوں نہ رو دیں مگر ایسا رونا نہیں جس رونے کی مشق عورتوں کو ہوتی ہے جب کہیں تعزیت وغیرہ میں جاتی ہیں تو ڈولی گاڑی میں اچھی خاصی ہوتی ہیں اور اس سے اترتے ہی ہو ہو کرنا شروع کر دیتی ہیں، غرض رونا جو غم میں بے ساختہ بوجہ جوش حزن ہو(۱) ممنوع نہیں بلکہ عین مراد حق ہے یہ بھی ہے کہ بطریق مذکور نفس کو تسلی دو، پس جب اس طرح مراد حق پوری ہو جائے تو اب اس رونے کے شغل کو چھوڑ دو اور اگر سوچ سوچ کر اس کو لے کر بیٹھ گئے تو یہ برا ہے اور حق تعالیٰ بزبان حقیقت اس کو پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے شخص جس کے پاس ہم ہوں اس کو کون چیز غمگین کر سکتی ہے تو جو اسی کو لے بیٹھا ہے، معلوم ہوا کہ ہم تجھ کو محبوب نہیں۔

محبت کا مظاہرہ

اور صاحبو! غور تو کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے قلوب میں جیسے محبوب تھے اتنا محبوب کسی محبّ کی نظر میں نہ کوئی ہوا اور نہ ہوگا، آپ کی محبوبیت کی یہ

(۱) غم کی شدت سے جو رونا بے ساختہ آجائے۔

کیفیت تھی کہ آپ کا آب دہن مبارک اور آب بینی (۱) صحابہ زمین پر نہ گرنے دیتے تھے فوراً اپنے منہ کو اور بدن کو مل لیتے تھے اور چاٹ لیتے تھے کوئی اس قصہ کو سن کر دل میں اپنے گھن نہ کرے اس لئے کہ اول تو محبت وہ شے ہے کہ کسی مرد اور عورت کے ساتھ اگر تعلق ہوجاتا ہے تو یہ معاملہ اس کے ساتھ بھی لوگ کرتے ہیں اور حالانکہ یہ محبت محض نفسانی وشہوانی ہوتی ہے اور جہاں محبت حقیقی ہو وہاں اگر یہ امر ہو تو تعجب کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس نفاست اور لطافت میں اس درجہ پر تھی کہ ہمارے علماء نے تصریح کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول و براز (۲) بھی پاک تھا۔ ایک صحابی نے غلطی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون پی لیا تھا ان کی اولاد میں کئی نسل تک خوشبو رہی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ مبارک بجائے عطر کے استعمال کیا جاتا تھا، پس جب آپ کے فضلات میں نہ بو تھی نہ کدورت تو پھر طبعی گھن بھی نہیں ہوسکتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کی یہ کیفیت تھی کہ عورتیں طبعاً اپنی اولاد کی محبت میں غرق ہوا کرتی ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی محبت کی یہ حالت تھی کہ ایک غزوہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے کہ ایک عورت سر راہ اشتیاق میں کھڑی تھی کسی نے کہا کہ تیرے بیٹے اور بھائی شہید ہوگئے تو وہ پوچھتی ہے کہ یہ تو بتلادو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحیح سلامت ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں وہ تو ہیں، کہنے لگی کہ کچھ پروا نہیں، ان کی تو یہ حالت تھی۔

فان ابی ووالدتی وعرضی لعرض محمد منکم وقاء (۴)

پھر اس قدر آپ کی محبوبیت پر آپ قیاس کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱) آپ کا تھوک اور ناک کی ریزش (۲) پیشاب پاخانہ (۳) یقیناً میرے باپ اور میری ماں اور میری آبرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لئے تم سے بچاؤ ہے"۔

وفات پر صحابہؓ کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ صحابہؓ پر یہ صدمہ ایسا ہوا کہ اس صدمہ کی نظیر روئے زمین پر نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی۔

صحابہ کا صبر واستقامت

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس صدمہ میں کیا کیا۔ سب سے زیادہ ہوش وحواس کے ساتھ اس صدمہ میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی رہے جو سب سے زیادہ عاشق تھے ورنہ بقیہ صحابہ کے شدت صدمہ سے ہوش بجا نہ تھے جب صدیق اکبرؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً منبر پر تشریف لے گئے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر خاص نظر تھی۔ جب ان کو منبر پر دیکھا سب منبر کے گرد جمع ہوگئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد حمد ونعت فرمایا: (الا ان من کان منکم یعبد محمدا فان محمدا قد مات ومن کان یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حی لا یموت)(۱) اور اس کے بعد یہ آیت ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا﴾(۲)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فانی ہونا بیان فرمایا اور جس کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے اس پر استقامت کی تعلیم فرمائی اور اس کے بعد حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾(۳) یعنی کسی جان کے لئے

(۱) ''یعنی آگاہ ہوجاؤ، بے شک جو تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وفات پاگئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ زندہ ہے ان کو موت نہ آئے گی'' (۲) ''یعنی نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر ایک رسول ان سے پہلے بھی بہت رسول گزر چکے ہیں کیا پس اگر وہ مرجائیں گے تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو شخص پھر جائے گا تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا'' سورہ ال عمران: ۱۴۴

(۳) آل عمران: ۳/۱۴۵۔

یہ نہیں ہے کہ وہ بغیر حکم الٰہی کے مر سکے اور آپ نے آیت بھی پڑھی ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ کلام سن کر ہماری یہ حالت ہوئی کہ گویا ہم نے یہ آیت پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں کلام اللہ سن کر جو حالت قلب کے تاثر کی ہوا کرتی ہے اس کو سن کر وہی حالت ہوگئی اور ہوش سے آ گئے۔

خدمت دین

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ غور کرنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے یعنی دین حق کی اشاعت اور احیاء وہ کام ہم کو کرنا چاہیے چنانچہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس شغل کو لے کر نہیں بیٹھے اور سب کے سب فوراً خدمت دین میں مصروف ہوگئے۔ چنانچہ غزوات اور فتوحات اور تفسیر اور حدیث اور فقہ اور علوم کی اشاعت خدمات دین اس درجہ تک کیں کہ نادان آدمی کو دیکھ کر سرسری نظر سے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہیں ہوئے تھے وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے علماء نے کئے حالانکہ یہ غلط ہے اس لئے کہ بنیاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے رکھی تھی اور بنیاد رکھنا ہی کسی کام کی، مشکل کام ہے اور جب بنیاد رکھی جائے اور بنیاد درست ہوجائے تو آگے اس کو چلانا کون سا مشکل کام ہے اسی مشکل کے موقوف علی الرسول ہونے کے مضمون کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ (۱) یعنی جو لوگ کافر ہوئے ہیں اہل کتاب اور مشرکین سے وہ

(۱) سورۃ البینۃ ۱۔۳

اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس دلیل روشن آئی اور وہ دلیل اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں کہ ان صحیفوں میں لکھے ہوئے مضبوط مضمون ہیں۔ غرض صحابہ نے اس صدمہ جانکاہ(۱) کا وظیفہ نہیں کیا حالانکہ صحابہ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا اور اسی وجہ سے صدمہ بے حد سخت تھا پس ہم کو بھی چاہیے کہ ہم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتدا کریں۔

نسخہ کیمیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: (اصیب بمصیبة فلیتعز بمصیته بی) (۲) یعنی جس کو کوئی مصیبت پہنچے اس کو چاہیے کہ میری مصیبت سے وہ تسلی حاصل کرے یعنی میری وفات سے جو میری امت کو صدمہ پہنچا ہے اس کو یاد کرے یعنی یہ سوچے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس میرے محبوب سے بھی زیادہ محبوب ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس حیات ظاہری میں نہ رہے اور اس پر ہم نے صبر کرلیا تو اس کی کیا پروا ہے اس پر وہ شخص شبہ کرسکتا ہے جو یہ کہے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہی نہیں لیکن مسلمان تو ایسا کہہ نہیں سکتا۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنی جان، اولاد اور مال سے زیادہ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور جس کو نہیں اس کی طرف ہمارا روئے سخن نہیں ہے (۳)۔ غرض ان طریقوں کے اختیار کرنے سے مصیبت کا جو زیادہ ناگواری کا درجہ ہے وہ نہ رہے گا ورنہ مصیبت اپنی اپنی حد سے بڑھ کر حضرت حق سے مانع ہوجائے گی اور یہ اور زیادہ مصیبت پر مصیبت ہوگی۔ یہ آداب ہیں مصیبت کے، الحاصل دو چیزیں حضرت حق

(۱) اس جان لیوا صدمہ کو لیکر نہیں بیٹھ گئے کہ اسی میں مشغول رہتے (۲) سنن ابن ماجہ، کتب الجنائز، باب ماجاء فی الصبر علی المصیبۃ: رقم الحدیث: ۱۵۹۹ (۳) وہ ہمارا مخاطب ہی نہیں۔

سے مانع ثابت ہوئیں، نعمت اور مصیبت پھر ان کی اور بہت سی جزئیات ہیں پس ان میں سے امہات جزئیات کی فہرست ان آیات میں ارشاد فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ یعنی کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے یہ علاج ہے مصیبت کے مانع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم مالک اور محبوب ہیں اور مصیبت ہمارے ہی حکم سے آتی ہے تو تم کو اس پر اعتراض اور چوں وچرا کا حق نہیں ہے اگر حق تعالیٰ کی مالکیت اور محبوبیت اور اس کا اعتقاد کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے قلب میں راسخ ہوجائے (۱) تو مصیبت کی شدت الم قلب کو ہرگز از جارفتہ نہ کرے گی (۲)۔ یہ نسخہ کیمیا کا اثر رکھتا ہے۔

فقدان عمل

آگے ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس علاج کی ہدایت فرماتا ہے۔ یہ جواب ہے ایک سوال کا جو جملہ اولیٰ کو سن کر ناشی ہوسکتا ہے (۳)۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے علاج تو بتلادیا اور ہمارا اس پر ایمان بھی ہے کہ مصیبت اس کے حکم سے آتی ہے لیکن قلب میں اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو اس کا جواب ارشاد ہے کہ تمہاری طرف سے ایمان اور ایقان ہونا چاہیے کام تم شروع کرو، یعنی یقین تم پختہ کرلو، باقی ہدایت اور اثر تو ہم دیں گے، ہاں جو تمہارا کام ہے اگر تم وہی نہ کرو تو اس کا کوئی علاج نہیں، ہم لوگوں کی آج کل یہ حالت ہے کہ کام تو کرتے نہیں اور ثمرات کی امیدیں باندھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے جیسے مریض کسی حکیم کے پاس گئے اور اس سے نسخہ لکھوایا اور شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ ہم کو شفا نہیں ہوئی کسی نے پوچھا کہ

(۱) دل میں جم جائے (۲) مصیبت کی شدید تکلیف بھی دل کو بے قابو نہ کرسکے گی (۳) پہلے جملے کو سنکر پیدا ہوسکتا ہے۔

میاں کسی طبیب سے تم نے معالجہ نہ کیا ایک نے کہا کہ جناب نسخہ تو میں نے لکھوالیا تھا، دوسرے نے کہا کہ میں نے نسخہ کے دام بھی پوچھ لئے تھے، تیسرے نے کہا کہ میں نے خرید بھی لیا تھا، چوتھے نے کہا کہ میں نے اس کو پکا بھی لیا تھا، پانچویں نے کہا کہ میں نے پکایا بھی اور اس کو برتن میں انڈیل بھی لیا تھا، چھٹے نے کہا کہ جناب میں نے پیا بھی لیکن فوراً قے کردی، خدا کی بتلائی ہوئی تعلیمات پر ہمارا ایسا ہی عمل ہے جیسا کہ ان مریضوں کا ہے کہ تعلیم پر ایک نے بھی عمل نہ کیا پھر شفا ہو تو کیسے ہو۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ لوگ کام نہیں کرتے اس طرف سے کچھ کمی نہیں کوئی ذرا کام شروع کرکے دیکھے ہماری تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ حرکت ہی نہیں ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ نظر کے روکنے پر قدرت نہیں ہے میں نے کہا کہ قدرت تو ہے ہاں یہ کہو کہ روکنے میں کلفت ہوتی ہے(۱) اس کو برداشت نہیں کرتے اور کرسکتے۔ تو بہت دیر تک الجھتے رہے اور میں ان کی ہر بات کا جواب دیتا رہا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ وہ اطراف کانپور کے رہنے والے تھے، وہاں جاکر انہوں نے خط بھیجا کہ واقعی میری سمجھ میں آگیا کہ قدرت ہے تو وہ بات کیا ہوئی کہ وہاں پہنچ کر انہوں نے کام شروع کیا۔ یعنی نظر کو روکا تو تجربہ ہوا اور اس سے پہلے کام تو نہیں کیا تھا، خالی باتیں بنارہے تھے اور اپنے خیال میں اس کو محال سمجھ رکھا تھا اس لئے الجھتے رہے اور بعضے لوگ کام بھی شروع کرتے ہیں اس کا کچھ اثر بھی ہوتا ہے مگر پھر کچھ غلبہ شہوات کا ہوتا ہے اور کام چھوڑ دیتے ہیں سو یہ لوگ طریقہ سے کام نہیں کرتے واللہ اگر طریقے کے موافق کام کریں تو ضرور ہدایت ہو۔

ہدایت کا راستہ

حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾

(۱) پریشانی ہوتی ہے۔

یعنی جو لوگ ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم ضرور ان کو اپنے راستے بتلاتے ہیں اسی طریق پر یہاں ارشاد ہے کہ تم کام کرو جب تم کام کروگے تو تمہارے قلب کو ہم ہدایت کریں گے۔ آگے ارشاد ہے: (وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ) یعنی اللہ ہر شے کو جانتا ہے پس یہ بھی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں سعی کرنے والا ہے (۱) اور کون نہیں ہے اس کے بعد جاننا چاہیے کہ مریض کو جو مرض پیش آتا ہے اس کا ایک علاج تو خاص اسی مرض کا ہوتا ہے اور اسی کا خاص پرہیز ہوتا ہے۔ مثلاً مرض اگر خطل سوداء (۲) کے سبب سے ہے تو اسی کا خاص علاج اور خاص پرہیز کرایا جاتا ہے کہ نسخہ بھی اسی کا اور جو چیزیں سوداء بڑھانے والی ہیں ان ہی سے بچنا بھی اور ایک عام علاج اور عام پرہیز ہے کہ جس کو تمام امراض میں پیش نظر رکھنا مریض کو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو چیزیں عامۃ مضعف اور کلیۃً منافی طبیعت ہیں (۳) ان سے بچنا چاہیے، یہاں تک تو حق تعالیٰ نے اس مرض یعنی مصیبت کے مانع عن الطریق ہونے کا خاص نسخہ کہ جو ایک خاص مراقبہ ہے کہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، ارشاد فرمایا تھا آگے ایک عام جس کا تمام اوقات میں ہر شخص کو التزام کرنا چاہیے ارشاد فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر خاص مرض کے لئے خاص نسخہ کا استعمال کیا اور قواعد عام صحت کی رعایت نہ رکھی تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع مرتب نہ ہوگا وہ عام علاج یہ ہے جس میں تندرست اور مریض سب شریک ہیں۔ یعنی ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ یعنی ہم نے جو خاص علاج خاص مرض کے لئے تم کو تعلیم کیا ہے اسی پر اقتصار نہ کرو کہ یہ مراقبہ تو کرلیا اور دیگر

(۱) کوشش کرنے والا (۲) سوداویت کی زیادتی کے سبب ہے (۳) جن چیزوں سے عام طور پر ضعف ہوتا ہے اور خلاف طبیعت ہیں۔

احکام شرعیہ میں اخلال کیا(۱) بلکہ اس کے ساتھ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امور میں اطاعت کرو اور یہ وہی وجہ ہے کہ (اطیعوا) کا متعلق ذکر نہیں فرمایا جس سے بقاعدہ بلاغت عموم مستفاد ہوتا ہے۔یعنی اگر تم نے صرف خاص اسی نسخہ کو استعمال کیا اور عام قواعد کی رعایت نہ کی۔ مثلاً احکام کی پابندی نہ کی اور معاصی کا ارتکاب کرتے رہے تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع متعدیہ تم کو نہ ہوگا اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ حق تعالیٰ نے جس مضمون کو ارشاد فرمایا ہے اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔اس کے بعد سمجھو کہ بعضے مریض ایسے سست اور کاہل یا کنجوس یا بد پرہیز ہوتے ہیں کہ طبیب سے نسخہ لکھوانا اور دوا خریدنا پھر اس کو پکا کر پینا اور پرہیز کرنا ان کو نہایت شاق اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے ہاں مرض کی شکایت کیا کرتے ہیں اور یہ کہا کرتے ہیں دوا دارو، تو صاحب ہم سے ہوتی نہیں کوئی شخص ایسے ملے کہ چھوکر دے اور مرض جاتا رہے۔

طبیب کا منصب

ایسے ہی روحانی مرض کے مریض بھی دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بکثرت ہیں کہ جو مجاہدہ ریاضت تو اختیار کرتے نہیں ہاں یہ چاہتے ہیں کہ کوئی بزرگ توجہ ڈال دیں اور ہمارا مرض جاتا رہے ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے۔ حالانکہ محض توجہ سے بغیر اپنے کئے کچھ نہیں ہوتا تو ایسے مریضوں کے لئے ارشاد ہے: ﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (۲)۔یعنی ہم نے جو تمہارے مرض کا علاج اپنے رسول کی معرفت ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم اس نسخہ کے استعمال کرنے اور اس کا جو خاص اور عام علاج و پرہیز ہے اس سے اعتراض کرو تو یاد رکھو کہ ہمارے

(۱) خلل ڈالا (۲) سورۃ التغابن:۱۲۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ تم کو علی الاعلان دوا اور پرہیز بتلا دیں کہ جو طبیب کا منصب ہے کیا طبیب کا یہ تھوڑا احسان ہے کہ تم کو دیکھ کر وہ دوا بتلا دے اس کے ذمہ یہ نہیں ہے اور نہ اس کے بس میں یہ ہے کہ شفا اور صحت تمہارے منہ میں زبردستی ٹھونس دے اگر تم کو اپنی صحت مد نظر ہے تو جو دوا بتلائی گئی ہے ہمت سے اس کا استعمال کرو ورنہ تم جانو اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء اور اولیاء کی توجہ میں برکت نہیں، بے شک برکت ہے لیکن وہ توجہ مشروط ہے اس کے ساتھ کہ تم بھی خود کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ ورنہ توجہ مؤثر نہیں ہوگی اور نہ اس کے متوجہ کرنے کا یہ طریق ہے کہ ہم لوگ کچھ نہ کریں اور نری تمنائیں کیا کریں کہ کوئی ہماری طرف متوجہ ہو جائے کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ تمہاری طرف متوجہ ہو۔ ہاں تم کام کرو، بزرگوں کو بھی توجہ ہوگی پھر اس توجہ کی برکات تم کو خود مشاہدہ ہو جاویں گی۔ دیکھو طبیب شفیق جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ مریض ہمارے نسخہ کو استعمال کر رہا ہے تو اس مریض کے حال پر خود توجہ ہوتی ہے اور پھر اس کے لئے قسم قسم کی دوائیں وہ خود تجویز کرتا ہے بلکہ اپنے پاس سے دیتا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کو صحت ہو جائے اور اگر یہ دیکھتا ہے کہ یہ دوا نہیں پیتا یا دوا پینے کے ساتھ جان کر بدپرہیزی کرتا ہے تو اس کو کچھ بھی خیال نہیں پس حضور کے وقت میں حضور کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے وارثوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے جب وہ دیکھیں گے کہ یہ شخص اللہ کی راہ میں مرکھپ رہا ہے اور اس نے کوئی دقیقہ اپنی وسعت کا اٹھا نہیں رکھا اور اس وقت اگر اس کی امداد نہ کی گئی تو کچھ عجب نہیں کہ ہمت ہار دے تو اس وقت ادھر سے فوراً مدد ہوگی واللہ وہ بڑے شفیق ہوتے ہیں اور بڑے دینے والے ہوتے ہیں، ہاں کوئی لینے والا چاہیے

یہ بیان تو ان لوگوں کا تھا جو کام میں لگے ہی نہیں اب ایک وہ ہیں جو کام کرتے ہیں اور ان کو اس کے کچھ ثمرات بھی حاصل ہوئے۔

ناز اور عجب

مگر ان میں ایک مرض پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ جہل اور کمی بصیرت(۱) سے یہ سمجھے کہ یہ ثمرات ہمارے کام کرنے سے مرتب ہوئے اور اس پر ان کو ناز اور عجب(۲) پیدا ہو گیا تو ان کے اس مرض کے دفعیہ کے لئے ارشاد ہے۔ ﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾(۳) مطلب یہ ہے کہ تم کو حضرت حق اور موجود حقیقی کے سامنے اپنے وجود کا دعویٰ کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ ارے یاد رکھو کہ ماسوا اس کے کوئی موجود حقیقی نہیں ہے پس ناز چہ معنی مومنین کو یہ چاہیے کہ اسی ایک ذات پر بھروسہ رکھیں اور غیر کو کہ جس میں اپنا وجود بھی ہے فانی محض اور ہالک محض سمجھیں نہ کہ اپنے وجود کا دعویٰ کریں تم کچھ بھی نہیں ہو اور نہ کچھ کر سکتے ہو یہ ہمارا ہی کام تھا کہ تم کو کام کی توفیق دی اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے اور پھر اس میں کامیابی عطا فرمائی۔ یہاں تک مصیبت کے متعلق بیان تھا جو مانع عن الطریق ہوتی ہے۔

عفو و درگذر

اب دوسرا مانع نعمۃ ہے کہ جو اپنی زیادہ گوارائی کے سبب مانع عن الطریق(۴) اور ہمارے لئے رہزن(۵) بن جاتی ہے آگے اس کے متعلق ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ﴾(۶) یعنی اے ایمان والو تمہاری بیبیوں اور تمہاری اولاد میں سے

(۱) ناسمجھی (۲) تکبر (۳) سورۃ التغابن: ۱۳ (۴) راستہ کی رکاوٹ (۵) ڈاکو (۶) سورۃ التغابن ۱۴۔

کچھ تمہارے دشمن بھی ہیں تو تم ان سے احتیاط رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تم کو اپنے اندر مشغول کر کے راہ حق سے ہٹادیں اور گو نعمتیں تو بہت ہیں لیکن دنیا میں اولاد اور ازواج انسان کو بہت محبوب ہوتی ہیں اس لئے بالتخصیص ان کا ذکر فرما کر ان سے تحذیر فرماتے ہیں اور اس آیت میں جو ازواج اور اولاد کو حق تعالیٰ نے مانع عن الطریق فرمایا ہے تو ان کا مانع ہونا دو طریق سے ہے اول طریق تو یہ ہے کہ اولاد اور ازواج ایسی فرمائشیں کریں کہ جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہیں اور یہ مغلوب ہو کر ان کا ارتکاب کریں۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ تو کچھ نہیں کہتے مگر یہ خود ان کی محبت میں ایسا مستغرق ہے(۱) کہ وہ محبت اس کو مانع(۲) بن رہی ہے پہلی صورت میں مانعیت اختیاری ہے ہر چند کہ ظاہر نظر میں یہ جملہ دونوں طریق کو عام معلوم ہوتا ہے لیکن مانعت آگے جو ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾(۳) یہ قرینہ اس بات کا ہے کہ یہاں مانعیت اختیاری ہی مراد لی جائے جس پر غصہ متحمل ہونے کے بعد عفو وصفح کی ترغیب واقع ہوئی چنانچہ شان نزول سے بھی اس مراد کی تعین ہوتی ہے۔

آیت کا شان نزول

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باہر کے کچھ مسلمان علوم سیکھنے کے لئے آ کر رہنا چاہتے تھے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جو شخص کسی گھر میں بڑا ہوتا ہے وہ اگر کہیں چلا جاتا ہے تو گھر بے رونق ہو جاتا ہے کبھی بعضی کلفتوں کا بھی خیال ہوا کرتا ہے اس لئے گھر کی بیبیاں بچے یہ ہی چاہا کرتے ہیں کہ یہ کہیں نہ جائیں چنانچہ ان کو بھی اسی طرح روکا مگر بعد

(۱) ڈوبا ہوا ہے (۲) رکاوٹ (۳) ''اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور ان کا گزشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے رحم والے ہیں'' سورۃ التغابن: ۱۴۔

چندے جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو انہوں نے دیکھا جو صحابہؓ اس سے پہلے آئے ہوئے تھے وہ اور مسائل میں بہت دور نکل گئے، ان کو بڑی حسرت اور ندامت ہوئی کہ ہم بیوی بچوں ہی میں رہے اور دوسرے لوگ بہت دور نکل گئے، اور ہم سے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ یہ سوچ کر ان کو اپنی اولاد اور ازواج پر غصہ آیا اور یہ ارادہ کیا کہ گھر جا کر ان کو خوب ماریں گے کہ ہم کو راہ حق سے مانع ہوئے تو جس وقت انہوں نے روکا تھا اس وقت جزو اول آیت کا یعنی (فَاحْذَرُوْهُمْ) تک نازل ہوا اور جب انہوں نے ان کے مارنے کوٹنے کا ارادہ کیا تو ﴿وَاِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوْا الخ﴾ نازل ہوا مطلب یہ ہے کہ اگر تم معاف کر دو اور سزا سے درگزر کر دو اور ان کا گزشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے تمہارے گناہ بھی بخش دے گا اور تمہارے حال پر رحم فرمائے گا۔ پس یہ قصہ اور یہ جزو، قرینہ اس کا ہے کہ یہاں اختیاری طریق مراد ہے۔

انہاک محبت

اور دوسری صورت اس سے مستنبط ہوتی ہے گو وہ مدلول مطابقی نہیں ہے لیکن مدلول التزامی ضرور ہے یا یوں کہوں کہ مدلول لفظی نہیں تو مدلول بدلالۃ النص ضروری ہے اور اس صورت میں ان کو (عَدُوًّا لَّكُمْ) فرمانا اس کے معنی اعتبار سے ہوگا کہ گو وہ مانعیت اور عداوت کے مباشر نہیں ہے لیکن سبب تو ہیں پس ان کو عدم فرمانا مشعر ذم ہے۔ درجہ سبب میں ہوگا نہ یہ کہ اس عداوت میں وہ عاصی ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک کبوتر کے پیچھے بھاگا جاتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان یتبع شیطان یعنی ایک شیطان ایک شیطان کے پیچھے جا رہا ہے۔ اس کو شیطان اس لئے فرمایا کہ اس کے حق میں تو اس نے شیطان ہی کا کام دیا کہ اس کو

ذکر اللہ سے غافل کر دیا پس ایسے ہی اولاد اور ازواج اس محبت کے حق میں بلا قصد عدو بن گئے کہ وہ ان کی محبت میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنا اصلی کام بھول گیا۔ پس اصل مانع اور مدار منع انہماک فی المحبت ہوا(۱) اور اس مدار کے اعتبار سے کہ محبوب کو عام ہوسکتا ہے۔ یہ مضمون جیسا کہ اولاد اور ازواج کو شامل ہے غیر اولاد اور غیر ازواج کو بھی (جس شے کی محبت میں بھی یہ مبتلا ہوکر اپنے مولا کو بھول جائے) عام ہوگیا جس کو صوفیاء نے اس عبارت سے ادا کیا ہے۔ (ماشغلك عن الحق فهو طاغوتك) ''جو چیز تجھ کو حق سے مانع ہوجائے وہ تیرا بت ہے'' کہ جو چیز بھی تجھ کو حق سے مانع ہوجائے وہ ہی تیرا بت ہے حکیم ثنائی اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

بہرچہ از دوست دامانی چہ کفرآن حرف وچہ ایمان
بہرچہ از یار دورافتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا(۲)

یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ بھی ہو۔

اور اس میں ایمان سے مراد ایمان حقیقی نہیں اس لئے کہ وہ تو عین مطلوب ہے نہ کہ مانع عن المطلوب بلکہ یہ ایسا ہے جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ ﴾(۳) اور اگر زیادہ غور کیا جائے تو یہ مانعیت غیر اختیاری بھی آیت کا مدلول مطابقی بن سکتا ہے اور ان تعفوا الخ اس پر بھی منطبق ہوجائے گا۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیسے مباشرت مانعیت پر غصہ آتا ہے سبب مانعیت بھی موجب غیظ ہوجاتا ہے کہ اس شے کی محبت ہم کو ہمارے مقصود میں مانع ہوئی ہے اس کو ہی اڑانا چاہیے۔ باقی رہا شان نزول تو اس کا جواب یہ ہے کہ (العبرة لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد) ''عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ خصوص مورد کا''

(۱) اصل ممانعت محبت میں انہماک کی ہے (۲) ''دوست کی طرف سے جو بھی حالت پیش آئے اس پر راضی رہو اس کی طرف سے جو بھی ملے اس کے اچھے برے کا خیال نہ کرو'' (۳) ''بری ہے وہ چیز جس کو تمہارے ایمان حکم دیتے ہیں'' سورۃ البقرہ: ۹۳۔

پس اس صورت میں آیت مانعیت کے دونوں طریق کو دلالۃ مطابقی سے شامل ہوجائے گی اور ﴿اِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا الخ﴾ ''اگر معاف کرو اور سزا سے درگزر کرو'' بھی بلاتکلف دونوں پر منطبق ہوجائے گا اور یہ دوطریق تو مانعیت کے ازواج اور اولاد کی حیات میں تھے کہ یا تو اولاد اور ازواج نے اس کو خود روکا تھا شاید خود ان کی محبت میں اس قدر مغلوب تھا کہ اللہ کی یاد سے رک گیا تھا۔

ابتلاء محبت

تیسری صورت میں ان کی مانعیت کی ایک اور ہے کہ اولاد یا ازواج مرگئے یہاں مصیبت اور محبت دونوں مانع جمع ہوگئے، محبت تو مقتضی ہے یاد کو، کہ اس کی وجہ سے یہ سب اشغال سے معطل ہوگیا اور محبوب کے فقدان کے الم کا مصیبت ہونا ظاہر ہی ہے اور وہ بھی شاغل عن الحق ہورہا ہے اور جاننا چاہیے کہ حیات محبوب میں جو مانعیت اور ممات محبوب میں جو مانعیت ہے یہ دونوں مانع نفس مانعیت میں تو مشترک ہیں لیکن ان میں ایک فرق ہے جس پر نظر کرکے بعد ممات والی مانعیت زیادہ عجیب اور فہم سلیم سے زیادہ بعید ہے۔ وہ یہ کہ محبوب کی حیات کی صورت میں تو فی الجملہ گو حقیقتاً نہ سہی مگر ظاہراً بہ نسبت حالت ممات کے شخص کسی قدر معذور بھی ہے کہ محبوب مجازی کا کچھ قرب ہے، کچھ مشاہدہ ہے یا امید مشاہدہ ہے یہ محرک ہوگیا ہے اس کی محبت میں ایسا مبتلا رہے گا کہ وہ محبت اس محبوب حقیقی سے مانع ہوگئی، مگر اس کے فقدان وممات کی صورت میں تو کوئی عذر نہیں ہے اس لئے کہ اس سے مفارقت بھی ہوگئی اور اس کی محبت کا کوئی محرک بھی نہ رہا، ادھر دوسرا محبوب یعنی حقیقی موجود ہے اور اس سے تسلی کرنا ممکن بھی ہے۔ پھر تعجب ہے کہ جو محبوب اس کے پاس موجود ہو اس میں تو مشغول ہوکر تسلی نہ پائے اور محبوب مجازی جو کہ سامنے موجود بھی نہیں اس کی یاد میں گھلے کہ جس کا کوئی نتیجہ سوائے

اپنی جان گھٹانے کے نہیں ہے واقعی یہ شخص بالکل معذور نہیں اور یہ ساری خرابی غیر اللہ کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق بڑھانے کی ہے۔

محبت اور شرک

یاد رکھو کہ یہ محبت بعض مرتبہ شرک کے درجے میں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ایسی محبت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ﴾(۱) یعنی بعضے لوگ ایسے بھی ہیں کہ سوائے اللہ کے انہوں نے شریک بنا رکھے ہیں کہ ان سے مثل اللہ کی محبت کے محبت کرتے ہیں، دیکھئے اس آیت میں جیسے کہ اتخاذ انداد یعنی شرک فی الالوہیت کی شکایت ہے اسی طرح یہ عمل بھی اسی درجہ میں محل شکایت ہے کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے خدا کے ساتھ ہونی چاہیے یعنی جیسی خدا کی محبت سے کسی وقت قلب خالی نہ ہونا چاہیے ایسی محبت دوسروں سے کرتے ہیں۔ واقعی ایسی محبت شرک کا شعبہ ہے اور شرک کا شعبہ ہونے کے علاوہ عذاب جان بھی ہے اور وہاں تو عذاب ہی ہوگا یہاں بھی سخت مصیبت ہے چنانچہ دوسرے مقام پر اسی مضمون کو ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾(۲) یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان منافقین کے اموال واولاد اچھے معلوم نہ ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ کا بس یہ ارادہ ہے کہ ان اموال اور اولاد کے سبب سے ان کو دنیا کی حیات ہی میں عذاب ہو۔ غرض سخت حسرت وافسوس ہے کہ دل محبوب حقیقی کے ہوتے ہوئے محبوب مردہ یا زندہ کے ساتھ (کہ وہ بھی اہل بصیرت کے نزدیک مردہ ہی ہے) لگایا جائے اگر کوئی کہے کہ اس تعجب کا مبنیٰ تو یہ مقدمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا زیادہ محبوب ہو تو اس کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ احب کے ہوتے ہوئے محبوب ادنیٰ کی طرف کیوں التفات ہے۔ سو یہ زیادہ

(۱) سورۃ البقرہ: ۱۶۵ (۲) سورۃ التوبہ: ۵۵

محبوب ہونا کہاں ثابت ہے۔ ہمارا زیادہ محبوب تو وہی تھا جس پر ہم مفتون ہیں تو جناب من آپ اس زیادہ محبوب ہونے کو تسلیم کر چکے ہیں ایمان لانا یہ خود اس احبیت کے اقرار کو مستلزم ہے(۱) چنانچہ اسی آیت میں ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ جو لوگ ایمان لائے ان کو سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہے پس آپ تو رجسٹری شدہ محبّ ہیں۔ ضرورت ہی اس بات کی نہیں ہے پس جب آپ عاشق اور محبّ ٹھہرے تو عاشق کے لئے بڑی غیرت کی بات ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر غیر پر نظر ڈالے۔ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک عورت چلی جارہی تھی اس نے دیکھا کہ میرے پیچھے ایک مرد آرہا ہے، پوچھا کہ میرے پیچھے کیوں آرہا ہے اس نے کہا کہ میں تیرا عاشق ہوں اس عورت نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے وہ شخص لوٹ گیا اس عورت نے بڑھ کر اس کے ایک دھول رسید (۲) کی اور یہ کہا:

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی دربیان دعویٰ خود صادقی
پس چرا برغیر افگندی نظر ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر (۳)

دیکھئے ایک ادنیٰ عورت نے جب شرکت پسند نہیں تو احکم الحاکمین کہ جس کو بے انتہا غیرت ہے اس کو کب پسند ہوگا کہ ہمارے چاہنے والے غیر پر نظر ڈالیں، غرض عشق تو سوائے محبوب کے کسی شے کو نہیں چھوڑتا۔

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت (۴)

ابراہیم بن ادھم کا حال

حضرت سلطان ابراہیم ابن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ جب سلطنت

(۱) ایمان لانا ہی اللہ کے زیادہ محبوب ہونے کی دلیل ہے (۲) جوتا اتار کر اسکو مارا (۳) ''اس نے کہا اے احمق اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعویٰ عشق میں سچا ہے پس کس واسطے غیر کی طرف متوجہ ہوا اے بے ہنر یہ محض عشق کا دعویٰ ہے'' (۴) ''عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے''۔

چھوڑ کر درویشی اختیار کی تھی تو گھر میں ایک بچہ چھوڑ گئے تھے۔ جب وہ بچہ جوان ہوا تو اس نے اپنے باپ کا پوچھا، کہا گیا وہ تو درویش ہوگئے، مکہ معظّمہ میں ہیں لڑکا مکہ معظّمہ حج کو پہنچا، مطاف میں دونوں باپ بیٹے کا اتفاق اجتماع بلا تعارف ہوگیا اور حضرت ابراہیم کی نظر اس پر پڑی، محبت کا جوش ہوا کئی بار اس کو دیکھا، مریدوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ ایک امرد حسین کو دیکھ رہے ہیں اس لئے یہ لڑکا بادشاہ کا لڑکا ناز ونعمت کا پلا ہوا نہایت حسین وجمیل تھا اور وہ زمانہ یہ زمانہ تو نہ تھا کہ جتنا زیادہ کوئی امرد پرست ہوا اتنا ہی زیادہ بزرگ ہو، اس زمانہ میں شریعت کے احکام کا غلبہ تھا، مریدوں کو گمان ہوا کہ بے شک شیخ کو لغزش ہوئی ہے بعد طواف کے ہم متنبہ کریں گے وہ لڑکا حضرت ابرہیم کی جستجو میں آیا تھا۔ بعد طواف کے ہر ایک سے پتہ حضرت ابراہیم کا پوچھتا تھا، لوگوں نے بتایا خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں اور میرا نام محمود ہے، حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ تم نے کچھ پڑھا بھی ہے عرض کیا کہ قرآن مجید اور علم دین پڑھا ہے پھر پوچھا کہ صوم وصلوٰۃ اور احکام شرعیہ کے پابند ہو، معلوم ہوا کہ پابند ہیں، دیکھئے اللہ کے بندوں کی ایسی محبت ہوتی ہے اس لئے پوچھا کہ اگر معلوم ہوگا کہ جاہل اور خدا ورسول کی مرضی کے خلاف ہے تو میرے کس کام کا ہے۔ جب اس کا ہر طرح سے کامل ہونا معلوم ہوا تو اور زیادہ محبت کا جوش ہوا اور سینہ سے لگایا، فوراً الہام ہوا کہ اے ابراہیم ہمارے ہوتے ہوئے غیر پر نظر۔

حب حق ہو دل میں یا حب پسر جمع ان دونوں کو تو ہر گز نہ کر

دعا کی اے اللہ یہ لڑکا میرے اور تیرے درمیان میں حجاب ہے اس حجاب کو اٹھالے فوراً اس کے گردہ میں درد ہوا اور جاں بحق ہوا لیکن اہل سیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ایک مرتبہ سینے لگا دینے سے سلطان محمود کے اندر نسبت قوی پیدا ہوگئی تھی، مزار ان کا مکہ کے باہر اب تک موجود ہے۔ اہل بصیرت ان کی نسبت

کی قوت کا احساس کرتے ہیں لیکن اس قصہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اولاد کے ساتھ محبت حرام ہے۔

درجات محبت

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا معاملہ ہر بندہ کے ساتھ جدا ہے بعضوں کے لئے تو غیر کے ساتھ ادنیٰ درجہ محبت کا بھی بلاضرورت ادائے حقوق پسند نہیں فرماتے اس لئے ان کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ ہوتا ہے ورنہ اولاد کے ساتھ محبت رکھنا اسی طرح ازواج کے ساتھ اسی طرح دوسرے تعلقات والوں کے ساتھ مشروع ہے بشرطیکہ غلو نہ ہو جس کا ضابطہ یہ ہے کہ جیسے مصیبت کے دو درجے تھے اسی طرح محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک محبت لاداء الحقوق (۱) دوسری محبت لتحصیل الحظوظ (۲) ادائے حقوق کے لئے جو محبت ہے وہ فی نفسہ عقلی محبت ہے اگرچہ اس میں طبیعت بھی ہو اور تحصیل حظوظ کے لئے جو محبت ہے وہ نری طبعی ہے اسی کا نام عشق ہے پس ادائے حقوق کے لئے جو محبت ہے اس میں کوئی ملامت نہیں ہے بلکہ ایک درجہ میں اس کی تحصیل ضروری ہے اور تحصیل حظوظ کے لئے بھی محبت منع نہیں بشرطیکہ واجبات اور محرمات میں اس سے اختلال نہ ہو مثلاً بیوی سے کسی کو عشق ہو کوئی ملامت نہیں لیکن اس کو بڑھائے نہیں اس لئے کہ بڑھ کر شاغل عن الحق ہو جائے گی (۳) ہاں اگر محبت بالکل نہ ہو اور یہ خوف ہے کہ مجھ سے ادائے حقوق میں کوتاہی ہوگی اس لئے محبت کی تحصیل کرتا ہے یا کچھ تو ہے مگر اس کو اس مصلحت ادائے حقوق کے لئے بڑھاتا ہے تو جائز بلکہ مستحب ہے اور جو اس قدر محبت موجود ہے کہ ادائے حقوق کے لئے کافی ہے مگر محض تحصیل لذت کے لئے اس کو بڑھاتا

(۱) حقوق کی ادائیگی کے لئے محبت (۲) حصول لذت کے لئے محبت (۳) حق سے روکنے والی ہو جائے گی۔

ہے یعنی ایسے اسباب غیر ضروری کا ارتکاب کرتا ہے کہ جن سے محبت بڑھے اور غرض لذت اور عیش پرستی ہے تو یہ برا ہے بلکہ بعض اوقات مفضی الی المضر ہوکر (۱) ظناً یا یقیناً حرام ہے اور یہ ہی راز ہے اس میں کہ حب کا تعویذ کرنا ناجائز ہے چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ بیوی کو حرام ہے کہ تسخیر زوج (۲) کے لئے تعویذ کرے، مطلب اس کا یہ ہے کہ جس وقت محبت بقدر ضرورت موجود ہے لیکن صرف اس واسطے کہ زوج میرا ہی الوبن جائے نہ ماں کا رہے نہ باپ کا تعویذ کرتی ہے یہ حرام ہے ہاں اگر حقوق ادا نہ کرتا ہو تو تعویذ وغیرہ کا کچھ مضائقہ نہیں۔ پس جبکہ محبت جائز کا بھی جیسے کہ زوجین میں ہوتی ہے بڑھانا حد سے زائد پسندیدہ نہیں تو جو محبت اصل سے ہی ناجائز ہے وہ تو کیوں کر قابل ملامت نہ ہوگی اور بیوی تو بیوی ہمارے مشائخ محققین نے تو شغل رابطہ کو کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے شیخ کی صورت کا تصور کیا کرے، پسند نہیں کیا ہے اور بعضوں نے ناجائز بھی کہا ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایسا تصور کرنا کہ غیر متصور کا تصور ہی نہ کرے یہ صرف خدا ہی کا حق ہے۔ چنانچہ مولانا اسماعیل صاحب شہید نے اس شغل کو (مَاهٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ) ''یہ کیا واہیات مورتیں ہیں جن کی عبادت پر تم جمے بیٹھے ہو'' میں داخل فرمایا ہے اسی طرح توجہ متعارف بین الصوفیہ کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ شیخ تمام خطرات سے خالی ہو کہ طالبین کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ محققین نے اس کو بھی ناپسند کیا ہے اس لئے کہ قلب کو ماسوا طالب سے جب خالی کرلیا تو حق تعالیٰ کی یاد بھی اس میں برائے نام ہی رہ جائے گی یعنی جتنی کہ قلب میں رچ چکی ہے اور درجہ اختیار سے نکل کر درجہ اضطرار میں پہنچ گئی ہے۔

توجہ الی اللہ

باقی قصداً توجہ الی اللہ نہ رہے گی اس لئے کہ قصد طالب کی طرف متوجہ ہے

(۱) بلکہ بعض مرتبہ یہ نقصان تک پہنچانے کا باعث ہوکر (۲) بیوی کے لئے شوہر کے واسطے ایسا تعویذ کرانا کہ وہ اس کا تابع ہوجائے جائز نہیں۔

تو اس وقت یہ شخص توجہ الی اللہ کا جو کہ مامور بہ ہے تارک ہوا کیونکہ مامور بہ توجہ اختیاری ہے نہ کہ اضطراری میں اس کی حرمت کا تو فتویٰ نہیں دیتا اس لئے کہ اکثر مشائخ کا معمول رہا ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ نیت ان حضرات کی اس میں خیر ہی کی تھی اس لئے جائز ہی کہتا ہوں مگر مجھ کو اس جائز سے اس قدر نفرت ہے جیسے بعض کو اوجھڑی کھانے سے نفرت ہوتی ہے مجھ کو اس میں بالکل صورت شرک کی سی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ خدا کا حق ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی شے کو دل میں نہ لائے۔ پس جبکہ اس شغل القلب (۱) بالغیر کو جس میں نیت بھی خیر ہے محققین نے پسند نہیں کیا تو جس محبت کا ثمرہ (لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا) ''تاکہ دنیا میں ان کو اس وجہ سے عذاب دے'' ہو اور جس تعلق کا نتیجہ ظلمت ہی ظلمت ہو وہ تو کیونکر ناجائز نہ ہوگی اور محبت کا بڑا سبب یا تو نظیر ہے اگر وہ مشاہد ہے اور اگر مرگیا ہے یا غائب ہے تو کثرت تخیل وتصور ہے پس نظر کی بھی حفاظت ضروری ہے اور تخیل اور تصور کو بھی دوسرے کام میں لگ کر متفرق کر دینا چاہیے ورنہ کثرت تخیل کا نتیجہ اکثر جنون ہوتا ہے۔ مولانا نصیحت میں فرماتے ہیں:

عشق بامردہ نباشد پائدار — عشق را باحی و باقیوم دار
عشق ہائے کز پے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود
غرق عشق شو کہ غرق است اندریں — عشق ہائے اولیں وآخریں (۲)
تو مگو مارا بداں شہ بار نیست — برکریما کارہا دشوار نیست

یعنی یہ مت کہو کہ ہمارا تو اس درگاہ میں دخل نہیں ہے اس لئے کہ کریم پر کار دشوار نہیں تم طلب تو کرو وہ کریم تم کو رسائی دے گا۔ افسوس ایسی ذات کے ساتھ تو

(۱) دل کو دوسرے کے ساتھ مشغول کرنے کی (۲) ''مردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں اس لئے اس حی وقیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے جو عشق محض رنگ وروپ پر ہوتا ہے اس کا انجام حسرت وندامت ہے وہ عشق نہیں، عشق حقیقی میں غرق ہوجاؤ اس میں غرق ہونا اولین وآخرین کا عشق ہے''۔

محبت نہ کریں کہ جو خود تم کو طلب کرے اور جس کی محبت میں ہر طرح کا چین لطف وسکون حاصل ہو اور ایسوں کے اوپر مریں کہ جن کی محبت سے مالیخولیا اور جنون اضطراب بے قراری بے چینی ہو اور اکثر وہ تمہاری طرف التفات بھی نہ کرے۔

مردہ کا تخیل

خصوصًا جس شخص نے مردہ کا تخیل غالب کرلیا ہو ایسے شخص کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ اپنا علاج کرے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دماغ صحیح نہیں ہے اور مردہ کو یاد کرکے زیادہ رونے سے ایک یہ بھی خرابی ہے کہ مردہ کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ صحابی بیمار ہوئے اور ان کو نزع شروع ہوا ان کی بیوی یہ کہہ کر رونے لگی ہائے میرے سردار انہوں نے آنکھ کھول کر منع کیا کہ کیا میں تم کو منع نہیں کرتا تھا کہ نوحہ مت کرنا۔ جب تم یہ کہتی تھی کہ ہائے سردار تو فرشتے مجھ کو کہتے تھے کہ کیا تو ایسا تھا، دیکھو اس طرح کی بات سننے سے بھی تکلیف ہی ہوتی ہے اسی طرح میری بڑی ہمشیرہ کے انتقال کے بعد میری تائی صاحبہ یعنی بڑی چچی بہت روتی تھیں۔ ایک بار مرحومہ کو خواب میں دیکھا، کہتی ہے کہ تائی تم نے رو رو کر ندی نالے بہادیئے، میں تمہارے پاس آیا کرتی مگر تم نے رستہ ہی نہ رکھا، اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اموات کو بعض اوقات احیاء کے افعال کا احساس ہوتا ہے(۱) اور وجہ اس کی کبھی یہ ہوتی ہے کہ فرشتے اطلاع کردیتے ہیں اور کبھی کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے اقتراب روحانی کا اذن ہوجاتا ہے(۲) اس سے ان کو ادراک ہوتا ہے۔ جلال الدین سیوطی نے شرح الصدور میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بزرگ اپنی والدہ کی قبر پر جاکر قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، ایک روز انہوں نے اپنی والدہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتی ہیں بیٹا جب تم میرے پاس

(۱) بعض اوقات مردوں کو زندوں کے افعال کا احساس ہوتا ہے (۲) روحانی قرب کی اجازت ہوجاتی ہے۔

آیا کرو تو آتے ہی قرآن مجید نہ شروع کر دیا کرو، تھوڑی دیر بیٹھ کر شروع کیا کرو تا کہ میں تم کو جی بھر کر اول دیکھ لیا کروں جب تم قرآن شروع کر دیتے ہو تو اس کے انوار تمہارے چہرے کو مجھ سے چھپا دیتے ہیں۔

حرام محبت

الحاصل یہ تفصیل تو حلال محبت میں تھی اور جو حرام محبت ہے جس کا نام لوگوں نے عشق رکھا ہے جس کو بجائے عشق کے اگر فسق کہا جائے تو بجا ہے خواہ وہ محبت عورتوں کے ساتھ ہو یا لڑکوں کے ساتھ یہ تو کسی طرح بھی جائز نہیں، آج کل لڑکوں کی محبت کا مرض بہت عام ہو گیا ہے اور یہ فتنہ عورتوں سے زیادہ سخت ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عورتیں تو خود بھی اجنبی مردوں سے بچتی ہیں اور ان میں حیا بھی ہوتی ہے اور نیز وہ پردہ میں بھی رہتی ہیں دوسرے یہ کہ عورت مرد ملیں تو فوراً لوگوں کو بدگمانی ہوتی ہے اور لڑکوں میں بچاؤ کی کوئی چیز نہیں ہے اس لئے اس میں ابتلاء بہت ہے اور نہایت سخت چیز ہے یہ وہ فعل ہے کہ جس نے قوم لوط کو تباہ کر دیا ہے اور جو لوگ اس میں مبتلا ہیں ان کی بہت سی قسمیں ہیں۔ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ لوطی کی تین قسمیں ہیں (قسم ینظرون وقسم یقبلون وقسم یفعلون)۔ یعنی ایک قسم تو وہ ہے جو صرف دیکھتے ہیں اور دوسری قسم جو بوس وکنار کرتے ہیں، تیسری قسم جو یہ فعل کرتے ہیں اور میں عرض کرتا ہوں کہ چوتھی قسم ایک اور ہے وہ یہ ہے۔ (یصورون ویتخیلون) یعنی تصور وتخیل میں مبتلا ہیں۔ یہ قلب کی لواطت ہے اور دلیل اس کی وہ حدیث ہے (والقلب یزنی وزنا ان یشتھی) اور یہ فعل زیادہ سخت اس لئے ہے کہ عورت کسی وقت حلال ہونے کا محل تو ہے اور اس فعل خبیث میں تو حلت کا وسوسہ بھی نہیں اور یہ فعل فطرت سلیمہ کے بالکل مبائن اور مخالف ہے اور اس فعل سے عقوبت بھی سخت بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ چند سال ہوئے تھانہ بھون کا ہی

قصہ ہے کہ ایک شخص حق تعالیٰ کی طرف مشغول تھا۔ اس کے قلب پر آیت وارد ہوئی: ﴿اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾(۱) یہ آیت قوم لوط کے بارے میں ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ ہم بیشک اس بستی والوں پر بسبب ان کے فسق کے آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اس شخص نے منبر پر بیٹھ کر سب کو سنادیا اور یہ کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس فعل خبیث میں مبتلا ہیں توبہ اور استغفار پڑھنا چاہیے لیکن کسی نے نہ سنا۔ اس کے بعد ہی اس شدت سے طاعون ہوا کہ گھر کے گھر خالی ہوگئے اور نظر بصیرت وکشفی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل کی ظلمت قلب پر بہت سخت ہے زنا میں اتنی ظلمت نہیں ہے فقط ہاتھ لگانے ہی سے بے حد ظلمت طاری ہوجاتی ہے اصل فعل کا درجہ تو آگے رہا، بزرگوں نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ جس شخص کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو امردوں کی محبت میں مبتلا کرتے ہیں یہ تمام تر کلام محبت کے بارے میں تھا۔

حب مال

تیسرا مانع کہ وہ بھی فرونعمت کا ہے حب مال ہے اس لئے آگے اس کو ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾(۲) یعنی تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہے اور اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے کیونکہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے اس لئے یہاں اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لئے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشاء اولاد کی محبت بھی ہے اس لئے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر یہ مذموم اور مانع نہیں(۳) اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوق شرعی فوت ہوتے

(۱) سورۃ العنکبوت:۳۴ (۲) سورۃ التغابن:۱۵ (۳) یہ بری اور منع نہیں۔

ہیں۔ چنانچہ آج کل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حب مال کا شعبہ ہے وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں اس زمانہ میں لوگ بڑے باہمت ہیں جو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اہل حقوق کو حقوق پہنچاتے ہیں۔ آج کل بڑے بڑے دیانتداروں کی یہ کیفیت ہے کہ نمازیں بہت پڑھیں گے حتیٰ کہ نوافل اور تسبیح ذکر و شغل کے پابند لیکن حقوق کے ادا کرنے میں تساہل حتیٰ کہ بعض علماء کا یہ حال ہے کہ کسی مردہ کے ورثہ اس کا مال ان کے مدرسہ یا مسجد میں لائیں بے تکلف لے لیتے ہیں نہ اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس کے کتنے وارث ہیں اور سب کو رضا مندی ہے یا نہیں کوئی ان میں بالغ تو نہیں ہے اس بلا میں باستثناء خاص خاص بندوں کے سب ہی مبتلا ہیں۔ خصوصًا مدارس میں تو اس چندہ کا قصہ بڑا نازک ہے۔ میں نے ایک جگہ کی حکایت سنی ہے کہ شادیوں کے موقع میں جو مدارس میں لوگ دیا کرتے ہیں سو ایک شادی ہوئی ایک خاص مدرسہ میں شادی والوں نے نہ دیا تو منتظم مدرسہ نے دعوت کے موقع پر میزبان سے خود کہا کہ مدرسہ کا حق نہیں آیا کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ حق کے یہاں کیا معنی ہیں حق تو وہ ہے جو شرعاً واجب ہو۔ بعض برادریوں میں دستور ہے کہ جس کے ہاں شادی ہو اس سے جبراً مدرسہ یا مسجد کے لئے کچھ مقدار خاص روپیہ کی لیتے ہیں جو بالکل ناجائز ہے۔ بہرحال عوام یا خاص باستثناء اخص الخواص سب ہی ان بے احتیاطیوں میں مبتلا ہیں جن میں خواص کے ان افعال اور تعلق اہل اموال سے بے حد ضرر ہو رہا ہے ایک موقع پر ایک ڈاڑھی منڈے صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم فلاں مدرسہ میں گئے تھے ہماری بڑی تعظیم کی گئی۔ دیکھو یہ ہماری تعظیم مال ہی کی وجہ سے ہے اگر ہم مالدار نہ ہوتے یا اس مال کی اہل مدرسہ کو امید نہ ہوتی تو ایسے علماء ہم کو کیوں پوچھتے، اتفاق سے میں ایک

مدرسہ میں کلکتہ گیا تو ان ہی حضرات نے جو اس وقت وہاں آئے ہوئے تھے میرا وعظ سنا میں نے وعظ کہا اور اس میں حب مال پر زیادہ مضمون بیان کیا۔ انہوں نے اس کی بھی شکایت کی، تھوڑا عرصہ ہوا نواب صاحب ڈھاکہ کی استدعا پر جو میں کلکتہ تک گیا تو ملے، بہت تعظیم سے پیش آئے اور کہنے لگے کہ ہم کو تو آنے سے ناامیدی ہوئی تھی نواب صاحب نے بیان کیا کہ اس نے (یعنی احقر نے) ایک شرط کی ہے جو مشکل ہے میں نے پوچھا کہ وہ شرط کیا نقل کی تھی کہنے لگے کہ نواب صاحب نے بیان کیا کہ یہ شرط کی ہے کہ ہم کو کچھ نہ دیا جائے، میں نے کہا کہ یہ شرط کیا مشکل ہے یہ تو بہت آسان ہے، وہ کہنے لگے کہ جناب یہ کیسے ہوسکتا ہے اپنے محبوب کی خدمت کرنے کو تو جی چاہا ہی کرتا ہے، میں نے کہا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محبوب کی خدمت محبوب کے گھر بیٹھے ہوئے کردی جائے، یہ ضروری ہے کہ بلا ہی کردیں کہنے لگے جناب گستاخی معاف پیاسا کنویں کے پاس جایا کرتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا، میں نے کہا کہ آہا تو کیا آپ ہم کو پیاسا اور اپنے آپ کو کنواں جانتے ہیں، واللہ آپ خود پیاسے ہیں اور ہم کنویں ہیں آپ اپنے کو دنیا کی دولت کی وجہ سے کنواں کہتے ہوں گے۔ سو بحمداللہ جس قدر دنیا کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے اور جس قدر تم کو دین کی ضرورت ہے اس سے تم لوگ مفلس ہو۔ غرض میں نے خوب ہی کان کھولے لیکن بولے بالکل نہیں۔ جب وہ چلے گئے تو لوگ کہنے لگے کہ بہت ہی اچھا ہوا یہ بڑا مغرور ہے جس کو چاہے کہہ لیتا ہے غرض ان مدارس کے چندوں نے علماء کو بہت بے وقعت کردیا ہے اگر علماء اپنی حالت درست کرلیں اور ان مالداروں کو منہ نہ لگائیں اور قناعت اختیار کرلیں تو پھر عوام پر بھی بہت اچھا اثر ہو اور جب علماء ہی کو اموال کے ساتھ اس قدر دلچسپی ہو کہ دولت مندوں کی خوشامدیں کریں تو

عوام بے چاروں کی کیا شکایت ہے واللہ اگر یہ لوگ خوشامد اور حرص چھوڑ کر استغناء کا معاملہ کریں تو امراء ان کے دروازوں پر خود آویں، البتہ آنے والوں کے ساتھ بداخلاقی نہ کریں اور فتنہ کے معنی یہاں وہ نہیں ہیں جس کو عام لوگ فتنہ فساد کہا کرتے ہیں بلکہ فتنہ کے معنی امتحان کے ہیں یعنی اولاد اور مال تمہارے لئے امتحان کی چیز ہے یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ مشغول ہوتے ہو یا ہماری طرف۔ اور جو امتحان میں کامیاب ہوگا اس کے واسطے اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

تقویٰ

یہاں موانع کی فہرست تمام ہوگئی اور وہ کل تین چیزیں ہوئیں ایک مصیبت اور نعمت کے افراد میں سے ایک اولاد ازواج، دوسرا مال اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مانعیت ان کی بوجہ افراط محبت و تاثر کے ہے اب اس مقام پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ محبت اور تاثر تو قلب میں ہوتا ہے اور وہ اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو سخت مصیبت ہوئی تو آگے اس کا جواب ارشاد ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾(۱) ''تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ سے جتنا تم سے ہوسکے'' مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کون کہتا ہے کہ تم آج ہی جنید جیسے ہوجاؤ میاں جس قدر تم سے ہوسکے تقویٰ کرتے رہو، رفتہ رفتہ مطلوب تک پہنچ جاؤ۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾(۲) ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے'' کی ناسخ ہے لیکن میرے تفسیر کردینے سے معلوم ہوا ہوگا کہ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے'' کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب آیت: (اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ) ''اللہ تعالیٰ سے

(۱) سورۃ التغابن: ۱۶ (۲) آل عمران: ۱۰۲۔

ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے'' نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور(۲) کے واسطے ہے اسی وقت اللہ سے ایسا درجہ تقویٰ حاصل کرلو جو حق ہے اس کا اور قاعدہ تو یہ ہی ہے کہ امر فور کے لئے نہیں ہوتا لیکن گاہ گاہ قرائن سے فور بھی محمل(۳) ہوتا ہے پس صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس احتمال سے کانپ اٹھے اس لئے جو حق ہے تقویٰ کا وہ فوراً کیسے حاصل ہوسکتا ہے تو اس کے بعد یہ آیت ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنا تم سے ہوسکے'' بطور اس تفسیر کے نازل ہوئی مطلب یہ ہوا کہ ﴿حَقَّ تُقٰتِه﴾ درجہ منتہی کا ہے اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علی الفور واجب نہیں ہے بلکہ بقدر استطاعت تقویٰ اختیار کرو اور بتدریج اس میں جتنی جتنی ہوسکے ترقی کرتے رہو حتی کہ جو تقویٰ مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے، پس اس تقریر سے ان دونوں آیتوں میں نسخ اصطلاحی نہیں ہوا اور بعض روایات میں جو یہاں نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم کو بھی شامل ہے اب یہاں پر یہ خلجان ہوا کہ تقویٰ کا سلسلہ ایسا دراز ہے کہ اس کے علوم موقوف علیہا اور اعمال معطی بہا کا احاطہ(۳) ہے حاصل نہیں تو عمل کی کیا صورت ہو، آگے اس کا دفعیہ فرماتے ہیں: ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ یعنی تم اپنا دستور العمل یہ بنالو کہ سنو اور مانو اور اپنی طبیعت کو پریشان نہ کرو، جب کوئی بات سنی فوراً اس پر عمل شروع کردو گو اس وقت احاطہ نہ ہو۔ البتہ یہ نہ کرو کہ سن کر غفلت اور عمل میں کوتاہی کرو، جیسا کہ ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں تمہارا مرید ہوں میں نے کہا کہ کب سے ہوئے تھے؟ کہا کہ پانچ برس ہوئے اور جو

(۱) فوراً عمل پیرا ہونے کے لئے ہے (۲) امر پر عمل درآمد فی الفور ضروری نہیں ہوتا کبھی کبھی کسی قرینہ کی بنا پر ہوتا ہے (۳) جب یہی معلوم نہیں کہ تقویٰ کا حصول کن افعال پر موقوف ہے اور اس تک پہنچانے والے افعال کیا ہیں تو عمل کیسے ہو۔

وظیفہ آپ نے بتلایا تھا وہ پڑھتا ہوں، میں نے کہا کہ بندہ خدا اس درمیان میں نہ خود آئے اور نہ خط کے ذریعے سے اپنے حال کی اطلاع کی، اچھے مرید ہو کبھی تم نے ایسا بھی کیا ہے کہ حکیم کو نبض دکھلا کر اور نسخہ لکھوا کر پانچ برس تک غائب رہے ہو وہاں تو گھنٹہ گھنٹہ بھر کے بعد حکیم جی کو اطلاع کرتے ہو اور یہاں تم نے پانچ برس کے بعد خبر لی ہے۔ افسوس کہ طالب کو چاہیے کہ جب کسی شیخ سے رجوع کرے تو دو امر اپنے اوپر لازم کرلے، اطلاع اور اتباع یعنی اطلاع اپنے احوال کی اور اتباع اس کی تعلیم کا پس ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا﴾ میں ایک اعلیٰ درجہ کا دستور العمل بتلا دیا گیا ہے اور چونکہ مال انسان کو بطبع محبوب ہے(۱) اور نیز انسان کے اندر بخل بھی طبعی سا ہے اس لئے تقویٰ کے افراد میں سے تعمیم بعد تخصیص کے طور پر اہتمام شان کے لئے اس کو مستقل طور سے بھی ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ﴾ ''اور خرچ بھی کیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا'' یعنی اپنے نفسوں کے مال خرچ کرو اور (لأنفسکم) اس لئے فرمایا کہ شاید تم یہ سمجھنے لگو کہ اس کا نفع حق تعالیٰ کو ہوگا۔ سو یاد رکھو کہ اس انفاق کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوگا(۲) ہم تو غنی بالذات ہیں اور چونکہ جملہ کلام سابق یعنی ﴿اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا﴾ سے بعضے کوتاہ بین ممکن ہے کہ یہ سمجھیں کہ صرف ظاہر احکام پر عمل کر لینے سے بس مقصود حاصل ہو جائے گا۔

تزکیہ نفس

اس لئے آگے ان اعمال ظاہرہ کی روح متعین فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾(۳) ''اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں'' مطلب یہ ہے کہ صرف اعمال ظاہرہ کی صورت پر مت

(۱) طبعاً پسندیدہ ہے (۲) اس کا فائدہ تم کو ہی ہوگا (۳) سورۃ الحشر: ۹

رہو بلکہ روح کو بھی حاصل کرو اور اس کو ہم ایک مختصر عنوان میں بیان کرتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفس کی حرص سے بچالیا جائے تو یہ لوگ ہیں کامیاب یعنی جب نفس کے اندر اس قدر سماحت پیدا ہوجائے کہ غیر اللہ کا تعلق اس میں نہ رہے اور غیر پر نہ گرے تو جانو کہ فلاح حاصل ہوگئی اور یہ روح عادتاً الٰہیہ میں حاصل ہوتی ہے اہل اللہ کی خدمت وصحبت سے اور یوق بصیغہ مجہول فرمایا یہ نہیں فرمایا: (وَ مَنْ یُّوْقِ نَفْسَہٗ) ''جو شخص بچے حرص سے'' اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ وقایۃً (نگہداشت) تمہارا کام نہیں ہے بلکہ بچانے والے ہم ہیں یعنی اپنے پر ناز نہ کرنا ہم ہی ہیں جو مقصود پر پہنچادیتے ہیں۔ جس کا ظاہری واسطہ اہل اللہ ہیں اس سے دوام مجاہدہ کی حد بھی بیان فرمادی کہ جب تک نفس کے اندر حرص اور شح باقی رہے اس وقت تک مجاہدہ نہ چھوڑو اور چونکہ نفس کے اندر حرص اور شح جبلی (۱) ہے کہ کسی طرح قابل زوال نہیں اس لئے مجاہدہ بھی مدۃ العمر (۲) ہی ضروری ہے۔ البتہ بعد چندے اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی اور چونکہ ﴿وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ الخ﴾ اس کی تمام حرصیں جو غیر اللہ کے متعلق ہیں چھڑانا مقصود ہے اور جب تک کہ نفس کو اس سے بڑی چیز کی حرص نہ دلائی جائے یہ نکل نہیں سکتی جیسے کسی کے پاس پیسہ ہو تو اس کو جب تک روپیہ یا گنی کا لالچ نہ دیا جائے اس کو چھوڑ نہیں سکتا اس لئے آگے ثمرہ اعمال کی خیر کی حرص دلاتے ہیں۔

حرص کی قسمیں

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ مطلق حرص مذموم (۳) نہیں بلکہ حرص کی دو قسمیں ہیں غیر اللہ کی حرص تو مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کی حرص محمود ہے (۴)۔ چنانچہ ارشاد

(۱) پیدائشی (۲) ساری عمر (۳) بری (۴) پسندیدہ۔

ہے: ﴿ إِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ ﴾(۱) یعنی ہم جو تم سے تمہارے اموال اور اولاد اور ازواج اور تمہارے جان چھڑانے (یعنی قلب سے نکالنے) کے لئے آیات سابقہ میں ارشاد کر آئے ہیں اس سے ڈرومت کہ ہم تو بالکل ہی مفلس ہو جائیں گے تم یہ سب چیزیں ہم کو قرض دے رہے ہو۔ سو اگر تم اچھا قرض دو گے یعنی خالص بلا ریاء کے یعنی ان کی حب مفرط(۲) کو چھوڑ دو گے اور جس کے لئے انفاق بھی لازم ہے جان کا بھی مال کا بھی تو ہم اس کو بڑھادیں گے۔ مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں:

خود کہ باید ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جان بستاند وصد جان دہد — آنچہ درد ہمت نیاید آن دہد(۳)

اور دوسرے مقام پر﴿ أَضْعَافًا كَثِيْرَةً ﴾ ہے یعنی بہت حصے بڑھادیں گے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بعض روایتوں میں جو سات سو تک مضاعفت(۴) آئی ہے اس سے مراد تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث اس پر صاف دلیل ہے وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ایک چھوارہ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے اب احد پہاڑ سے چھوارہ کے حجم کے برابر ٹکڑے کرو، دیکھو کس قدر ہوتے ہیں، سنکھوں مہا سنکھوں(۵) تک نوبت پہنچتی اور اگر وزن میں چھوارہ کے برابر ٹکڑے کرو تو اور بھی زیادہ ہوں گے۔ اب یہاں خیال ہوتا ہے کہ ہاں دیں گے تو سہی لیکن ہمارے جرائم اس قدر ہیں کہ یہ سب ثواب اس میں نہ کہیں وضع ہو جائیں(۶) جیسے ملازم

(۱) سورۃ التغابن:۱۷ (۲) حد سے متجاوز محبت (۳) ''تم ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے چمن ہی کو خرید لو، حقیر اور فانی جان لیتے ہیں اور جان باقی (ہمیشہ رہنے والی جان) عطا کرتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں وہ عطا کرتے ہیں'' (۴) سات سو تک بڑھانے کا ذکر ہے (۵) سو کروڑ کا ایک ارب اور سو ارب کا ایک کھرب اور سو کھرب کا ایک سنکھ اور سو سنکھوں کا مہاسنکھ۔ اور سو مہاسنکھوں کا ایک نیل اور سو نیل کا ایک پدہم (۶) اس کے بدلے کاٹ نہ لئے جائیں۔

کی تنخواہ جرم کے سبب ضبط ہوجاتی ہے اس کے لئے آگے ارشاد ہے: ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ﴾ یعنی گناہوں سے اندیشہ نہ کرو سب بخش دیں گے اور چونکہ انسان بہت کم حوصلہ ہے اس لئے اس مضمون کو سن کر خیال اور تعجب ہوسکتا ہے کہ اس قدر عطا اور پھر اس کے ساتھ مغفرت کیسے ہوگی تو اس لئے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ یعنی اس عطا اور مغفرت سے تعجب نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ شکور یعنی بہت قدردان اور بہت حلم والے ہیں تمہاری طرح ذراسی بات پر ان کو غصہ نہیں آتا بلکہ سب معاف فرمادیتے ہیں۔ باقی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مغفرت بلاتوبہ بدرجہ وعدہ ان کے ہی واسطے ہے جو پہلے گناہوں سے صدق دل سے توبہ کرلیں اور آئندہ کو اصلاح کا قصد کریں جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ م بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا لا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ م بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۱)

اور چونکہ پہلے قرض کو حسن کے ساتھ موصوف کرکے یہ بتلایا ہے کہ حاصل عمل ہو۔ ریاء اس میں نہ ہو تو ممکن ہے کہ بعضوں کا خیال ہوجائے اور اس پر ناز ہوجائے کہ ہمارے اعمال خالص ہیں اس لئے آگے ارشاد ہے: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ یعنی غیب اور شہادت کے ہم عالم ہیں اور اسی میں خلوص اور ریاء بھی داخل ہے پس کوئی شخص اپنے اوپر ناز نہ کرے اور نہ دوسرے کو براء سمجھے اس لئے کہ وہ عزیز زبردست بھی ہیں کہ ناز کرنے والے کا ناز توڑ دیتے ہیں اور بعض مرتبہ

(۱) ''پھر تمہارا رب ان لوگوں کے لئے جنہوں نے جہالت سے برے اعمال کیے پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کرلی اور اصلاح کرلی، بے شک تمہارا رب بعد اس کے گناہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے'' سورۃ النحل: ۱۱۹۔

بڑائی اور تعجب کی سزا میں جو التواء ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حکیم ہیں سب کام حکمت سے کرتے ہیں اور اس التواء میں بھی حکمت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے موانع طریق کی تفصیل اور ساتھ ساتھ ان کے رفع کی تدبیریں ارشاد فرمائی ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

اس وعظ میں حضرت نے طرز زندگی کا دستور العمل اور اہل تصوف کی معمول بہ چند چیزوں کا ذکر فرمایا جو یہ ہیں، تہجد، تلاوت قرآن، تبلیغ دین، ذکر، تبتل، توکل نیز صبر تہجد سے محروم رہنے والوں کی غلطی بیان فرمائی۔ احقر محمد عبداللہ

خلیل احمد تھانوی